چہرہ چہرہ مری کہانی



محمود شام

غزلیں اور نظمیں

ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ
مین اُردو بازار۔ کراچی۔ فون: 2633151

CHERA CHERA MERY KAHANI

Poetry by
Mahmood Shaam

اشاعت: 2005
مطبع: اے بی سی پرنٹرز
قیمت: 225 روپے

مصنف کا ای میل ایڈریس: bullcart.2005@yahoo.com
مصنف کی ویب سائٹ: www.mahmoodsham.com

ناشر

ویلکم بک پورٹ، مین اردو بازار، کراچی
فون: 021-2639581/2633151
فیکس: 021-2638086
ای میل: wbp@welbooks.com
ویب: www.welbooks.com

پوتی عبیرہ کی حیرتوں

اور پوتے باسل کی مسکراہٹ کے نام



ترتیب

نظمیں

اکیسویں صدی کا ایڈیشن

'چہرہ چہرہ مری کہانی' سے پہلے اگرچہ میری طویل نظم 'کارڈیوسپارم' 1970ء میں اور 'آخری رقص' (اپنی نظموں اور غیر ملکی شعراء کے منظوم تراجم پر مشتمل) 1972ء میں شائع ہو چکے تھے۔ لیکن 1975ء میں منظر عام پر آنے والے ''چہرہ چہرہ مری کہانی' کو میں اپنا پہلا مجموعہ کلام خیال کرتا ہوں۔ اس کے مختلف ایڈیشن شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس میں 1960 سے 1974ء تک کہی جانے والی غزلیں نظمیں شامل تھیں۔ جب مجھے لوگ شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے، صحافت کے حوالے نے ابھی شاعری پر غلبہ نہیں پایا تھا۔ اس کے بعد نوشتۂ دیوار، قربانیوں کا موسم بھی شائع ہوئیں۔ آخر میں 'محلوں میں سرحدیں' لیکن 'چہرہ چہرہ مری کہانی' کی خوشبو اسی طرح برقرار رہی۔ میں قارئین کو زیادہ زحمت نہیں دینا چاہتا۔ اس لئے 'آخری رقص' ''نوشتۂ دیوار' اور 'قربانیوں کا موسم' میں سے کچھ غزلیں، نظمیں انتخاب کر کے 'شہر سے جنگ'' کے نام سے پیش کر دی ہیں۔ اب آخری رقص نہیں ہوگا۔ نوشتۂ دیوار نہیں پڑھنا پڑے گا۔ 'قربانیوں کا موسم' اب نہیں آئے گا۔ اب صرف 'چہرہ چہرہ مری کہانی' محلوں میں سرحدیں' اور 'شہر سے جنگ' آپ کے سامنے، نئے لب و لہجہ، نئی تراکیب، استعاروں اور تشبیہات کے ساتھ آئیں گی۔ چہرہ چہرہ مری کہانی میں کچھ تازہ شعری تجربے بھی شامل کر دیئے ہیں۔ اس طرح بیسویں صدی کے چھٹے اور ساتویں عشرے کی میری سوچوں کے ساتھ اب آپ اسی صدی کے آخری عشرے اور اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں میرے دھیان میں جگمگانے والے کچھ خیالات ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ غزل اور نظم دونوں کا سفر جاری ہے، آپ کی رائے میرے لئے اب بھی خیال انگیز ہو سکتی ہے۔ تحسین اور تنقید دونوں کا خیر مقدم ہوگا۔ ای میل سے یا خط کے ذریعے ضرور رابطہ قائم کیجئے۔

محمود شام

5 اکتوبر 2005

زندگی کارت جگا

ظہیر کاشمیری کے بعد محمود شام ہی غالباً وہ رند مشرب ادیب ہے جس نے داڑھی کو نشان امتیاز بنا رکھا ہے۔ شروع شروع میں تو اسے یہ تبرک اپنے خاندانی ماحول سے ملا مگر آخر آخر اس نے شاید اسے لینن کی سنت سمجھ کر اپنائے رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ایک روایت پسند گھرانے میں پیدا ہوا۔ پٹیالے سے جھنگ تک کا سفر اس نے 1947ء میں کیا۔ چونکہ یہ سفر بچپن میں طے ہوا تھا اس لئے وہ 'پٹیالہ رنگ، سے آشنا ہونے کی بجائے 'جھنگ رنگ، میں ڈوب گیا اور جب کچھ اور بڑا ہوا تو اس نے لاہور کا رخ کیا یہاں اس نے کالج کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود پرانی روایت کی گٹھری سر سے نہ اتاری بلکہ اس کے ہاتھ میں فرسودہ عقائد کا ایک سانپ جیسا عصا بھی تھما دیا گیا، اور پٹیالے کا یہ مسافر زندگی کے سفر میں بھی جھنگ سے آگے نہ نکل سکا۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں غالباً 1964ء کی بات ہے محمود شام کی کچھ نظمیں ادھر ادھر گھومتی گھامتی مجھ تک پہنچیں۔ میں نے محمود شام کی وضع قطع اور اس کے حلقہ احباب کے پس منظر میں جب ان نظموں کا مطالعہ کیا تو مجھے یوں لگا جیسے محمود شام نے یہ نظمیں کسی سے لکھوائی ہیں یا محمود شام ان نظموں میں جھوٹ بول رہا ہے، کہاں محمود شام کہاں سوچ کے نئے زاویے۔ جی چاہا کبھی محمود شام ایسے عالم میں دکھائی دے کہ اس کا اوپر کا چھلکا اتار دوں۔ چنانچہ ایک دن ایسا بھی آیا کہ اس چلغوزے کے اندر کا سفید اور مزیدار محمود شام باہر آ گیا۔ وہ دن اور آج کا دن۔ اس نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ اس نے فن کے سائنسی نظریوں کو ایسا اپنایا کہ فرسودگی کی تمام تر پرچھائیاں ہوا ہو گئیں وہ صحافت میں گیا تو اپنی الگ سے پہچان کرا لی۔ اس نے ادبی نثر

لکھی تو اس پر اس کی اپنی چھاپ رہی، وہ شاعر کے روپ میں ظاہر ہوا تو انفرادیت نے اس کے قدم چومے۔ وہ ہر معاملے میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کا قائل ہے۔ صحافی کے طور پر اس نے انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا تو اندرا گاندھی سے لے کر پہاڑوں سے اترتے ہوئے جوگیوں تک اس کے نرغے میں آ گئے۔ کتابیں لکھیں تو بھٹو صاحب سے لے کر رمضانیوں تک کا احاطہ کر لیا اور جب شاعری پہ کمند پھینکی تو اپنی بیماری کے دوران نظموں کی ایک پوری کتاب لکھ ڈالی اور اس کتاب کو اپنی بیماری کا ہم نام بنا دیا۔ اب محمود شام کا نیا مجموعہ کلام آ رہا ہے۔ آپ دیکھیں گے جن موضوعات کے پتھروں کو دوسروں نے چوم کر چھوڑ دیا ہے ان پہاڑ جیسے پتھروں کا بوجھ محمود شام نے بآسانی اٹھا لیا ہے۔ اس نے شاعری کے ماؤنٹ ایورسٹ کو بھی سر کر لیا ہے۔ اس کے راستے میں کیا کیا مصیبتیں آئیں اس نے کسی کی پروا نہیں کی۔ ناہموار چٹانوں نے اسے ڈرایا برف کے طوفاں امڈتے رہے اور کبھی کبھی تو اس نے برفانی آدمیوں کے پاؤں کے نشانات بھی دیکھے لیکن اسے تو نظریہ فن کی اس چوٹی تک ضرور پہنچنا تھا جہاں لینن، ماؤزے تنگ اور مارکس کے مجسمے جگمگا رہے ہیں۔ جہاں اس کا اپنا وطن اس کے لئے آغوش وا کیے ہوئے ہے جہاں سائنسی اشتراکی چاندنی کے خمیر سے ایک ایسے معاشرے کا سویرا ابھر رہا ہے جو پاکستان کے مستقبل کا سویرا ہے۔ رشوت اور منافع خوری سے پاک، دھاندلی اور بے انصافی سے مبرا۔ قومی وحدت اور ملی یگانگت کا پیامبر۔ بھوک اور ایمانداری، اور افلاس کا دشمن اور اہل فن کا ہمدرد و غمخوار۔ یہی وہ سویرا ہے جس کیلئے محمود شام نے زندگی بھر کا رتجگا قبول کر رکھا ہے۔

قتیل شفائی

1975

دیباچہ

غزل میری زندگی کا حاصل ہے۔

لمحوں کا ایک طویل سفر، ان غزلوں سے عبارت ہے۔

میری زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ مقامات بدلے ہیں۔ ہم سفر تبدیل ہوئے ہیں لیکن غزل ایک ایسی ہم سفر ہے۔ جس سے برسوں سے ساتھ نہیں چھوٹا۔ اپنی غزلیں خود میرے لئے ایک آئینہ ہیں، جب کبھی تنہائی میں، میں بکھر جاتا ہوں تو اپنے آپ کو ان غزلوں میں تلاش کر کر کے یکجا کرتا ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ میں خود ان شعروں میں ریزہ ریزہ ہوں۔ زندگی کے واقعات، حادثات، اتفاقات کبھی نہ بھولنے والے لمحے، جذباتی تجربات، سب ان غزلوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے حوالے سے مجھے اپنی ذات کے منتشر ذرات کو جمع کرنے میں مدد ملتی ہے۔

یہ سفر پنجاب کے ایک چھوٹے سے شہر سے شروع ہوتا ہے۔ جھنگ۔ جس سے ہیر رانجھے کی رومانی داستان وابستہ ہے۔ ریت کے ٹیلے، ہرے بھرے پیڑ۔ اداس اداس خاموش گھروندے، محنت اور عزم کے جذبات لئے چہرے، سات سات پردوں میں لپٹا ہوا حسن۔ اپنے آپ سے بے خبر الھڑ مٹیاریں، چپ چاپ زندگی کا سفر طے کرتی نہریں، سردیوں میں اپنے وجود کو بچانے کی کوشش کرتے اور گرمیوں میں دوسروں کا وجود مٹاتے دریا، کناروں پر گھنے گھنے پیڑوں کے چھتنار بیلے۔ تا حد نظر پھیلے ریت کے ٹیلے جہاں رات کو چاندنی بکھرتی ہے تو لگتا ہے کہ ایک سنہرا دریا بہہ رہا ہے، بوڑھے درخت جو دن میں چھاؤں بخشتے ہیں اور رات کو عمر رفتہ کی کہانیاں سناتے ہیں۔

یہاں تیز روشنیاں ہیں نہ آنکھیں چندھیاتی ہیں، نہ حسن بالکل بے نقاب ہوتا ہے۔ تخیل کو ہر

وقت جلاملتی ہے۔ ذہن سوچوں کے وسیع وعریض سبزہ زاروں میں ہرنیوں کی طرح قلانچیں بھرتا پھرتا ہے۔

جھنگ سے شعر کی ایک طویل روایت وابستہ ہے۔ حضرت سلطان باہوؒ اور دوسرے عارفین کے بعد جدید شعرا میں مجید امجد مرحوم جعفر طاہر، شیر افضل جعفری، طاہر سردھنوی مرحوم، رفعت سلطان، رام ریاض، اردو پنجابی کے منفرد شاعر شارب انصاری۔ یہ روایت آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ ماحول جو صنعتی تبدیلیوں سے متاثر نہیں ہوا، جہاں جدید شہری زندگی کی سہولتیں نہیں ہیں۔ اس لئے یہاں تخیل کو بہت دور تک پرواز کا موقع ملتا ہے۔

میں جب شعر کہنے لگتا ہوں تو مجھے اپنا یہ ماحول ہی اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ میری غزلوں کا منظر نامہ اسی سے ترتیب پاتا ہے۔ طاہر سردھنوی مرحوم قادر الکلام شاعر ہیں۔ زبان اور عروض پر مکمل گرفت ہے۔ اپنے انداز میں اپنی بات کہتے ہیں۔ زمانے نے انہیں اگرچہ کچھ نہیں دیا ہے لیکن انہوں نے زمانے کو اتنی مرصع، مسجع اور بھرپور غزلیں دیں۔ ایک زمانہ ان کے چشمہ سے فیض یاب ہوا میں ان کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہ کرتا ہوں، شاعری کی الف۔ ب ان سے ہی سیکھتا ہوں۔ گورنمنٹ کالج جھنگ سے بی۔ اے کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے لاہور جانا پڑتا ہے اس لئے طاہر سردھنوی مرحوم سے وہ مسلسل رابطہ نہیں رہتا ہے لیکن اب انہوں نے کہہ دیا ہے کہ مجھے اصلاح کی ضرورت نہیں رہی ہے (طاہر سردھنوی مرحوم تخلیقی قوتوں سے مالا مال تھے لیکن دنیوی نعمتوں سے محروم رہے، آج سے چار برس پیشتر، وہ اپنی اسی گوشہ نشینی کی زندگی میں چپ چاپ ہم سے جدا ہو گئے)

لاہور آیا۔ میرے ہم جماعت ایم۔ اے میں داخلہ کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ میرے حالات ایسے نہ تھے کہ داخلہ لے سکتا کیونکہ میں ہفت روزہ 'لیل ونہار' (اس وقت پروگریسیو پیپرز لمیٹڈ کے زیر اہتمام نکلتا تھا) میں شائع ہونے والی ایک غزل کا معاوضہ مبلغ نو روپے چودہ آنے (معاوضہ دس روپے ہوتا تھا دو آنے منی آرڈر فیس کٹ جاتی تھی) موصول ہو جانے کی وجہ سے لاہور پہنچ سکا تھا۔ ہمارے ایک ساتھی ضیاء الحق۔ بی۔ اے میں اول رہے تھے۔ ان کے داخلے کے سلسلے میں ہم گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر نذیر احمد سے ملنے گئے۔ ڈاکٹر نذیر احمد ایک زمانے میں گورنمنٹ کالج جھنگ کے پرنسپل رہے ہیں۔ ایک برس پہلے جلسہ تقسیم اسناد وانعامات میں وہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے بھی آئے تھے۔ انہیں جھنگ سے ایک تعلق خاطر تھا۔ ہم ان

کے کمرے میں گئے تو ہم نے بتایا ''جھنگ سے آئے ہیں'' میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''تم محمود شام ہو۔؟''

''جی'' میں نے کہا۔

''تمہاری غزل چھپی ہے، ماہِ نو میں''

''جی؟''

پھر تھوڑی دیر بعد انہوں نے میرے ساتھیوں سے کہا ''آپ لوگ جائیں، مجھے ان سے کچھ بات کرنا ہے۔''

وہ لوگ جو داخلہ لینے آئے تھے، وہ چلے گئے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے گاؤن پہنا اور مجھے ساتھ لے کر چل پڑے۔ عظیم گورنمنٹ کالج، جس کی محرابوں میں سے گزرتے ہوئے مجھے اپنے پست قامت ہونے کا کچھ زیادہ ہی احساس ہو رہا تھا، ان محرابوں میں سے کتنے عظیم لوگ گزرتے رہے ہیں۔ مفکر، شاعر، علامہ اقبال، پطرس بخاری، صوفی تبسم، ن۔ م راشد، جیلانی کامران۔

ڈاکٹر صاحب مجھے ذکریا خواجہ سے ملواتے ہیں، پروفیسر صدیق کلیم سے۔ پھر کالج ٹک شاپ میں جناب قیوم نظر سے ملواتے ہیں، میری اس غزل کا ذکر کرتے ہیں، سنتے بھی ہیں۔

عمر گزری کہ تری دھن میں چلا تھا دریا
جابجا گھومتا ہے آج بھی یہ پگلا دریا

پھر ڈاکٹر نذیر احمد مجھے وہ سب رعایتیں دیتے ہیں جن کے نہ ہونے سے میں نے مزید پڑھائی کا ارادہ ہی ترک کر دیا تھا ایک غزل کی وجہ سے میں لاہور تک پہنچ سکا۔ اور ایک غزل کی وجہ سے ڈاکٹر نذیر احمد نے مجھے تمام رعایتیں دے کر عظیم درسگاہ کے دروازے مجھ پر کھول دیئے۔ غزل نے میری زندگی میں اتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ تو مجھے غزل سے انتہائی جذباتی وابستگی کیوں نہ ہو۔

میں یہ اعتراف کروں گا کہ جھنگ جیسے پسماندہ شہر میں جتنی غزلیں کہیں، اتنی لاہور کراچی میں نہیں کہہ سکا۔ یہ ایک چھوٹے شہر اور بڑے شہر کے ماحول، تہذیب اور تمدن کا فرق ہے۔ جمالیاتی قدریں بھی تبدیل ہو جاتی ہیں۔ چھوٹے شہروں میں حسن پردوں میں نہاں ہوتا ہے۔ حسن فطرت بالکل عیاں ہو جاتا ہے حسن کے لئے اس وقت تک ہی زیادہ ڈوب کر لکھنا ممکن ہے، جب تک وہ عیاں نہ ہو۔ پھر تخیل کے لئے کچھ بھی تو نہیں رہ جاتا۔ چھوٹے شہر میں جی تنہائی سے اکتا جاتا ہے لیکن بڑے شہروں میں جی محفلوں سے بیزار ہو جاتا ہے۔ گھڑی بھر کی تنہائی، ایک

نعمت غیر مترقبہ ہوتی ہے۔

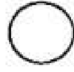
میں نے نظمیں بھی لکھی ہیں، 'کارڈیو سپازم' طویل نظم شائع ہو چکی ہے۔ سیاسی منظومات اور منظوم تراجم 'آخری رقص' میں شامل ہیں۔ غزلیں پہلے سے لکھ رہا ہوں۔ غزلوں میں عمر بتائی ہے۔ دیر سے اس لئے چھپ رہی ہیں کہ یہ میری عمر کا حاصل ہیں۔ میں نے انہیں بار بار دیکھا ہے، لفظوں کو بار بار پرکھا ہے۔ ایک گونہ اطمینان کر لینے کے بعد جھجکتے جھجکتے۔ آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔

غزل کا ایک شعر۔ میرے لئے کئی نظموں پر بھاری رہا ہے۔ ایک شعر میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات اس کا اظہار ایک پوری نظم میں ہو پاتا ہے۔ میں نے غزل کو خاص مضامین تک محدود نہیں رکھا ہے اور نہ الفاظ کی حد بندی کی ہے جو کچھ محسوس کیا ہے، جس طرح محسوس کیا ہے جس mیں محسوس کیا ہے۔ اسی طرح لکھنے کو ترجیح دی ہے۔ اس طرح کچھ نئے الفاظ بھی غزل کی دنیا میں داخل ہو گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا حق تھا کہ وہ غزل کا موضوع بنیں۔ غزل کا ماحول ایک نجی ماحول ہوتا ہے۔ غالب و میر نے اپنے ماحول کی بات کی تھی۔ ہم اپنے ماحول کی بات کیوں نہ کریں۔ آج حسن و عشق میں کیا فون ایک رومانی رابطہ نہیں ہے۔ ڈائری، کار، ڈنر، آج کی عاشقی کے عناصر ترکیبی ہیں۔

غزلیں آپ کے سامنے ہیں۔ چند نظمیں بھی ہیں۔ میرا یہ زندگی بھر کا سرمایہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

محمود شام

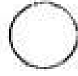
۲۲ دسمبر ۷۴ء



نبض چپ چاپ کھڑی ہے یارو
یہ گھڑی کون گھڑی ہے یارو

پھر ہوا سرد ہوئی جاتی ہے
پھر کہیں برف پڑی ہے یارو

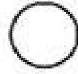
اس نے بھی آج بلایا ہے مجھے
دھوپ بھی آج کڑی ہے یارو



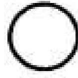
کوئی پتھر ہے نہ کانٹا کوئی
ایسے رستوں پہ سفر کیا ہوگا



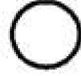
پھر ابھرنے لگا غم کا سورج
آ گیا یاد سحر دم کوئی



دل کا چراغ بجھ گیا، روح کی رات ڈھل گئی
موت کی تیز دھوپ سے زیست کی شاخ جل گئی

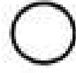


جب بھنور کی کشمکش راس آگئی
تب کناروں نے پکارا ہے مجھے



اپنے دل کا چراغ روشن ہے
اور کوئی دیا ہوا نہ ہوا!!

ان کی ہر بات مستند ٹھہری
اپنا ہر واقعہ فسانہ ہوا!!



دل میں وہ یوں سما رہے ہیں!
سانس خوشبو سی پا رہے ہیں

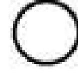
چاندنی شب ہے چاند تارے
اپنے جوبن پہ آ رہے ہیں

تیری یادوں کے تند جھونکے
دل کی شمعیں بجھا رہے ہیں

راستے پاؤں چومتے ہیں
ہم تری سمت آ رہے ہیں

نہر کے ہونٹ کانپتے ہیں
کون طوفان آ رہے ہیں

شام پیڑوں کے سائے کیسے
چاندنی میں نہا رہے ہیں



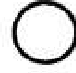
ہم بھرے ساون میں تیرے گھر گئے
بجلیاں چلائیں، بادل ڈر گئے

جب بھی مہکی تیری یادوں کی نسیم
دل کے صحرا خوشبوؤں سے بھر گئے

صبح آئی، دوستو ماتم کرو!!
رات ڈوبی چاند تارے مر گئے

جھڑتی تھی جن کے لبوں سے چاندنی
اب کہاں وہ سقف و بام و در گئے

وقت کی بوسیدہ دیواروں سے شام
آدمی مٹی کی صورت جھڑ گئے



آنکھ سلگے کبھی جی گھبرائے
سانس کی ڈور الجھتی جائے

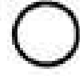
پھر صبا پیڑ کو چھوکر گزری!
پھر تڑپتے رہے پہروں سائے

لاکھ پھیلاؤ تم اپنی بانہیں
پھول کب لوٹ کے شاخ پہ آئے

وہ سمٹتی سی لجاتی سی نظر
جس طرح چاند کرن اٹھلائے

سب پہ طاری ہے یہاں تشنہ لبی
کون معیارِ طلب ٹھہرائے

شہرِ احساس ہے سونا سونا
شام جی کوئی غزل ہو جائے



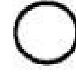
آج کیوں ہم سے لپٹتی ہے صبا　　تو نے اے دوست بلایا تو نہیں

دل کے آنگن میں بھٹکتے سائے　　کچھ یہاں تو نے گنوایا تو نہیں

تیرے چہرے پہ تغیر کیوں ہے　　حال دل ہم نے سنایا تو نہیں

شام ڈھلتی ہے تو میں سوچتا ہوں　　زندگی موت کا سایا تو نہیں

شاؔم جی کھوئے سے رہتے ہو سدا
کیا کوئی دل میں سمایا تو نہیں



پھر موسمِ خیال کی ٹھنڈی ہوا چلی
پھر پھیلنے لگی تری خوشبو گلی گلی

دل کیفِ انتظار میں یوں ڈھل کے رہ گیا
پانی میں جیسے گھل گئی ہو برف کی ڈلی

کتنے مکاں جھانکتی پھرتی ہے چاندنی
کیا جانے کس کو ڈھونڈتی پھرتی ہے منچلی

تیرا خیال گرمیوں کی صبح سا حسیں
یادوں میں تیری سردیوں کی دھوپ ہے ڈھلی

ویراں ہیں ایک عمر سے آنکھوں کے گل کدے
اس کو تو یاد آئے بھی مدت ہی ہو چلی

شب کو تو شام چاند ستارے بھی ساتھ تھے
پڑنے لگی جو دھوپ تو اک اک نے راہ لی

اڑنے لگی ہے نیند چھبن، لوگ سو گئے
جادو جگا رہی ہے پون، لوگ سو گئے

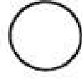
دن بھر حنا میں دل کا لہو گھولتے رہے
اب آئی ہے جو رات دلہن، لوگ سو گئے

ساحل کی نرم ریت پہ رقصاں ہے چاندنی
مسکا رہا ہے نیل گگن، لوگ سو گئے

پت جھڑ کی لہر پھیلتی جاتی ہے شاخ شاخ
ویران ہو رہے ہیں چمن، لوگ سو گئے

کیا رات کی ہواؤں نے جادو جگا دیا
کانٹوں پہ کتنے پھول بدن لوگ سو گئے

پھر شام بند کھڑکیوں کے اونگھتے کواڑ
سہلا رہی ہے چاند کرن، لوگ سو گئے



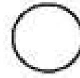
اب کہاں وہ لوگ جن کے نام سے
بجلیاں اٹھتی تھیں ہر اک گام سے

زندگی ہے پیڑ کا سایا نہیں
کیسے بیٹھو گے یہاں آرام سے

بند کر کے اکثر ان آنکھوں کے پٹ
تجھ کو دیکھا دیدۂ اوہام سے

اس کے گھر سے آئی ہے ٹھنڈی ہوا
روشنی بہتی ہے اس کے بام سے

چاند کس کس کو پلائے چاندنی
لاکھ پاگل پھر رہے ہیں شام سے



بھولی بھالی چاندنی نادان سی
دے گئی ہے اک لگن انجان سی

کٹ گیا ہے جب سے اس گھر کا درخت
یہ گلی لگتی ہے کچھ سنسان سی!

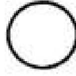
جب بھی اترے تیری یادوں کے ہجوم
دل کی بستی ہوگئی کنعان سی

اب کہاں وہ کہکشاں در چشم لوگ
کھڑکیاں رہتی ہیں کچھ حیران سی

سردیوں کی گدگداتی دھوپ میں
راحتیں ملتی ہیں تیرے دھیان سی

ان چلے رستوں پہ لہراتی ہے دھند
شام ان کے وعدہ و پیمان سی

جب بھی تیرے ستم کی بات چلی
میرے ہمراہ کائنات چلی
چاند کی جستجو میں نکلے تھے
کہکشاں بھی ہمارے ساتھ چلی
چاندنی جانے کیوں سمٹ سی گئی
جب ترے پیرہن کی بات چلی
آج پھر آ گیا ہے موج میں دل
آج پھر بادِ حادثات چلی
دور تک گونجتے ہیں سناٹے
ہم کو لے کر کدھر حیات چلی
ٹہنیاں ہوگئیں برہنہ تن
یوں تری بات پات پات چلی
لوگ ملنے لگے بہت، جب سے
رسمِ ترکِ تعلقات چلی
شام سے لوگ پھر رہے ہیں اداس
آج یہ کس ادا سے رات چلی



گونج رہی ہے دل میں یوں بھولی باتوں کی چاپ
جیسے وقت کے آنگن میں جاتے لمحوں کی چاپ

اس کے دھیان میں اے مورکھ! تو اپنا آپ بھلا
دل کی دھڑکن روک کے سن، اس کے قدموں کی چاپ

جانے دل کیوں ڈول اٹھتا ہے، بھر آتی ہے آنکھ
تھراتی ہے جب راہوں پر راہرووں کی چاپ

رینگتے لمحے، چیختی یادیں، ساں ساں کرتی رات
سونے گھر کا آنگن اور سوکھے پتوں کی چاپ

شام اندھیرے توڑ رہے ہیں دھیرے دھیرے سانس
پل پل بڑھتی جاتی ہے سورج کرنوں کی چاپ

دل کے پاتال سے ابھرا ہے کوئی
ذہن کے بام پہ آیا ہے کوئی

سوچ کے دائرے بتلاتے ہیں
دھیان کی جھیل میں اترا ہے کوئی

کبھی سایا، کبھی خوشبو بن کر
دل کے آنگن میں لہکتا ہے کوئی

پھر امڈ آئی ہے اوہام کی دھند
پھر سرِراہ تمنا ہے کوئی

جگمگاتے ہیں منڈیروں پہ دیئے
شام سورج کہیں ڈوبا ہے کوئی

جب سے ہم تیرا شہر چھوڑ گئے
پھر کسی بام پر نہ دیپ جلے

لوگ آ کر یہاں چلے بھی گئے
ہم وہی محو انتظار رہے

شب کی تنہائیوں میں سوچ کبھی
کچھ تو کہتے ہیں زرد پیڑ تجھے

اس زمانے کی تیرگی میں کوئی
خود کو ڈھونڈے، تجھے تلاش کرے

پھر گلستاں سے جا رہی ہے خزاں
پھر بجاتے ہیں تالیاں پتے

دل کی دھڑکن میں ڈوب جاتی ہیں
بانسری کی صدائیں رات ڈھلے

یاد آئے نہیں وہ مدت سے
شام ملنے کے دن قریب ہوئے

اک بوالعجبی شہر کا قانون بنی ہے

جو تیرا طلب گار ہے گردن زدنی ہے

ٹکرائے ہیں ظلمت کی فصیلوں سے کبھی ہم

دہکے ہوئے سورج سے کبھی اپنی ٹھنی ہے

پلکوں پہ بھڑکتی ہے مگر کتنی خنک ہے

یہ آگ ترے دھیان کی خوشبو سے چھنی ہے

تپتے ہیں کڑی دھوپ میں پیڑوں کے ہرے جسم

لوگوں کے سروں پر تو مگر چھاؤں گھنی ہے

سہتا رہا موہوم صداؤں کے تھپیڑے

اب تک مرے ادراک کے سینے پہ بنی ہے

حالات کی زنجیر میں جکڑے ہیں مرے پاؤں

ہر سمت رہ و رسم کی اک باڑ تنی ہے

اس دور میں، ان سنگدل افراد میں رہنا

اپنے لئے اب شاؔم ، یہی کوہ کنی ہے

کیا ہوئے پھول سے بدن کچھ سوچ
چھپ گئے چاند کیوں معاً، کچھ سوچ

کیوں سسکتی ہے چاندنی شب بھر
آہیں بھرتی ہے کیوں پون، کچھ سوچ

سر جھکائے کھڑی رہی پہروں
تیری دہلیز پر کرن، کچھ سوچ

روح کا ساتھ کون دائم ہے
پھول سے اٹھ گئی چبھن، کچھ سوچ

بام ودر پہ بھی کچھ اداسی ہے
کھوئے کھوئے سے ہیں چمن، کچھ سوچ

دیکھ! ہر شاخ ہے کڑی زنجیر
باغ میں جا نہ دفعتاً، کچھ سوچ

پھر ترے شہر میں ہے شام بھئی
کہاں جائے گا بے وطن، کچھ سوچ

لے اڑا ایسے ترا دھیان مجھے
تو بھی لگتی ہے اب انجان مجھے

ہر صدا تیری صدا لگتی ہے
کیا بناتے ہیں مرے کان مجھے

ریت کا ڈھیر بنا دے نہ کہیں
دھوپ میں تپتا بیابان مجھے

سنسناتے ہیں در و بامِ خیال
کر گیا کون یہ ویران مجھے

میں نے پہچان لیا ہے تجھ کو
اب نہ کر مفت پریشان مجھے

رچ گئی جس میں ترے درد کی دھوپ
میں وہی شام ہوں پہچان مجھے

دل کا عجیب حال ہے تیری صدا کے بعد

جیسے کہ آسمان کا منظر گھٹا کے بعد

کیا کیا نقوش ہم نے ابھارے تھے ریت پر

باقی رہا نہ کوئی بھی وحشی ہوا کے بعد

بکھری ہوئی تھیں چارسو پھولوں کی پتیاں

گلشن سنور سنور گیا بادِ صبا کے بعد

اب تک فضا میں گونجتی ہے ایک نغمگی

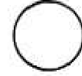
سارا جہاں ہی رقص میں ہے اس صدا کے بعد

اب تک جلا رہی ہے ہمیں تہمتوں کی دھوپ

ہم تو اجاڑ ہو گئے فصلِ وفا کے بعد

یادیں، کھلے کواڑ، یہ مہکی ہوئی فضا

کون آ رہا ہے شام یہ ٹھنڈی ہوا کے بعد



حشر ظلمات سے دل ڈرتا ہے
اس گھنی رات سے دل ڈرتا ہے

برف احساس نہ گل جائے کہیں
سیل اوقات سے دل ڈرتا ہے

تو بھی اے دوست نہ ہو جائے جدا
اب ہر اک بات سے دل ڈرتا ہے

یہ کڑی دھوپ، دہکتا سورج
سائے کے سات سے دل ڈرتا ہے

ہائے وہ رینگتی تنہائی، جب
اپنی ہی ذات سے دل ڈرتا ہے

کیسے دیکھیں گے وہ اجڑی آنکھیں
اب ملاقات سے دل ڈرتا ہے

زخم ہو جائیں گے باغوں کے ہرے
شامِ برسات سے دل ڈرتا ہے

پیڑوں کی چھاؤں جب گھنی تھی اپنی کہیں نہیں ٹھنی تھی

اجڑے گھروں کی خامشی میں پنہاں عجیب راگنی تھی

اک چاند یاد آگیا تھا پلکوں سے چاندنی چھنی تھی

ملتے تھے آدمی بھی کیا کیا جب شہر میں رسم گل زنی تھی

در پر تھی نرم نرم دستک دیکھا جو اٹھ کے چاندنی تھی

بادل ابھی ابھی کھلے تھے رنگت گھروں کی دیدنی تھی

جلووں میں جب نہائیں آنکھیں دل میں غضب کی روشنی تھی

جب شام ڈھل رہا تھا سورج
لمحوں کی جان پر بنی تھی

جھانکتے لوگ، کھلے دروازے

چاند کا شہر بنے دروازے

کس کی آہٹ کا فسوں طاری ہے

محو ہیں آج بڑے دروازے

بول کے دیں نہ کبھی دیواریں

سر پٹختے ہی رہے دروازے

لوگ محفوظ ہوئے کمروں میں

برف کی زد میں رہے دروازے

کبھی سورج کی، کبھی ظلمت کی

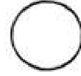
مار سہتے ہی رہے دروازے

رات بھر چاندنی ٹکرائی......مگر

صبح ہوتے ہی کھلے دروازے

دیکھ وہ شام کی آہٹ ابھری

دیکھ وہ بند ہوئے دروازے



بجلی کی طرح گھور گھٹاؤں پہ گرو بھی
ڈھل جائے یہ اَڑی ہوئی شب، کچھ تو کہو بھی

اس سائے کو، خوشبو کو ذرا غور سے دیکھو
پھر شہر میں آؤ، اسے پہچان سکو بھی

کہتی ہے تمہیں کچھ تو پہاڑوں کی خموشی
کچھ دیر رکو، کان لگاؤ، تو سنو بھی

راہوں نے بڑے پیار سے پھیلائے ہیں بازو
یہ سرد مکاں چھوڑو، کسی سمت چلو بھی

بس یونہی چمکتی ہوئی رنگت پہ نہ جاؤ
اندر نہ کہیں تلخ ہو بادام چکھو بھی

میلہ سا لگا رہتا ہے اک دل کے نگر میں
بکھری تھیں عجب رنگتیں خواہش کے سفر میں

پھر دل ہے گھنی رات ہے اور چیختی یادیں
اترے ہیں وہی سائے پھر اجڑے ہوئے گھر میں

جاتے ہوئے جس شخص نے مڑ کر بھی نہ دیکھا
کیا رنگ بھری چاہتیں تھیں اس کی نظر میں

ہر تیرگی پھیلائے گا یہ زرد اندھیرا
سب خوف سمٹ آئے ہیں اس لمحے کے ڈر میں

پھر شام ہے مہکے ہیں وہ بے خواب دریچے
پھر ڈوب چلے راستے رنگوں کے بھنور میں

جانے اے دوست! کیا ہوا ہم کو
تیرا غم بھی نہ اب رہا ہم کو

ہم نہ آئیں کہیں یہ ممکن ہے
آپ دیں تو سہی صدا ہم کو

خشک پتے ہیں ہم نہ جانے کب
لے اڑے باؤلی ہوا ہم کو

کب سے ہیں ہم تو گوش برآواز
کچھ تو اے خامشی سنا ہم کو

کس لئے خوار ہوں تلاش میں ہم
خود ہی ڈھونڈے گا راستا ہم کو

یونہی آ آ کے لپٹے جاتی ہے
جانے کہتی ہے کیا صبا ہم کو

ہوگئی دور سارے دن کی تھکن
شام سے وہ سکوں ملا ہم کو

کس رنگ میں ہیں اہل وفا، اس سے نہ کہنا
کیوں پھول ہیں خوشبو سے جدا، اس سے نہ کہنا

ڈوبی نہیں مدت سے جو نظروں کے بھنور میں
اس آنکھ کا جو حال ہوا، اس سے نہ کہنا

یادوں کے در و بام پہ اک نام، وہی نام
کیا جانئے کے بار لکھا، اس سے نہ کہنا

لپٹی تھی دریچوں سے حسیں چاندنی کیسے
کیا کیا مجھے تاروں نے کہا، اس سے نہ کہنا

بجھتی ہی نہیں پیاس، یہاں جلتے لبوں کی
بن برسے گزرتی ہے گھٹا، اس سے نہ کہنا

بکھری تھیں کبھی رنگتیں اس سونے نگر میں
اب شام نہ خوشبو نہ ہوا، اس سے نہ کہنا

تیری سانسوں کی مہک پھیلے، زمانے ہوگئے
یہ جدائی کی ہوا چلتے زمانے ہوگئے

اب خلاؤں میں بھٹکتی ہیں نگاہیں رات دن
تیری نظروں میں نظر ڈوبے زمانے ہوگئے

کوئی دھڑکن، کوئی آہٹ، کوئی نغمہ کوئی فون
کان میں تیری صدا کھنکے زمانے ہوگئے

اپنے ہاتھوں سے مٹی جاتی ہے اب دل کی لکیر
دل میں چاہت کی دھنک بکھرے زمانے ہوگئے

دھیمے دھیمے سانس ہائے اف، وہ لہجے کی تھکن
کتنی مدت ہوگئی، کتنے زمانے ہوگئے

کیا خبر کیسے ترے دن رات کٹتے ہوں ادھر
خواہشوں کی کرچیاں چنتے، زمانے ہوگئے

تیرے وعدے، تیری قسمیں تیری باتیں، تیرے لفظ
کن سرابوں میں ہمیں بستے زمانے ہوگئے

دھیان کی گلیاں ہیں سونی، دیکھ اے موج نسیم
ان خرابوں سے تجھے گزرے، زمانے ہوگئے

شاؔم بس اک رات ہی تھی درمیاں لیکن ہمیں
اس نسیم صبح سے بچھڑے زمانے ہوگئے

اس کو تکتے بھی نہیں تھے پہلے ہم بھی خود دار تھے کتنے پہلے

اس کو دیکھا تو یہ محسوس ہوا ہم بہت دور تھے خود سے پہلے

دل نظر آتے ہیں اب آنکھوں میں کتنے گہرے تھے یہ چشمے پہلے

کھوئے رہتے ہیں اب اس کی دھن میں جس کو تکتے نہ تھے پہلے پہلے

ہم کو پہچان لیا کرتے تھے یہ ترے شہر کے رستے پہلے

اب اجالوں میں بھٹک جاتے ہیں رہ سجھاتے تھے اندھیرے پہلے

اب نہ الفاظ، نہ احساس، نہ یاد اتنے مفلس نہ ہوئے تھے پہلے

رنگ کے جال میں آتے نہ کبھی پاس سے دیکھ جو لیتے پہلے

گرم ہنگامہ کاغذ ہے یہاں بے مہک پھول کہاں تھے پہلے

شہر نت پوچھتا ہے کون ہو تم لوگ تم سے نہ تھے تم سے پہلے

ایک اک آنکھ ہے پرتو اپنا ہم کہاں بکھرے تھے اتنے پہلے

ہم نے دیکھی نہ تھی دل کی کالک کتنے روشن تھے یہ چہرے پہلے

شاؔم صاحب ذرا ملتے جائیں

اس طرف جانے سے پہلے پہلے

تپتی ہوئی راہوں پہ پھرایا مجھے دن بھر
یوں تیرے تصور نے ستایا مجھے دن بھر

دل میں وہ کسک چھوڑ گیا صبح کا تارا
اک لمحہ بھی آرام نہ آیا مجھے دن بھر

ویران بیاباں میں، کبھی اجڑے گھروں میں
پھرتا رہا لے کر ترا سایا مجھے دن بھر

دیتی رہی چاندنی شب بھر مجھے آواز
سورج نے بھی رہ رہ کے بلایا مجھے دن بھر

ہر سمت بھرے شہر تھے کیا جانیے پھر بھی
تنہائی کے احساس نے کھایا مجھے دن بھر

لہجے میں گھنی چھاؤں کے، پتوں کی زباں میں
پیڑوں نے ترا حال سنایا مجھے دن بھر

اک پل میں ہی بتلا گئیں دم توڑتی کرنیں
وہ راز جو اے شام نہ پایا مجھے دن بھر

○

پھر اک ساتھی مجھے اکیلا چھوڑ گیا
آپ سدھارا اپنا سایا چھوڑ گیا

اس کو کتنے پیڑ صدائیں دیتے تھے
وہ تو سب کو یونہی بلاتا چھوڑ گیا

اب تک میدانوں کے جسم چمکتے ہیں
جانے کیسی مٹی دریا چھوڑ گیا

لپٹ لپٹ کر اک دوجے سے روتے ہیں
جن پتوں کو ہوا کا جھونکا چھوڑ گیا

چاندنی شب! تو جس کو ڈھونڈنے آئی ہے
یہ کمرہ وہ شخص تو کب کا چھوڑ گیا

چال تھی کتنی تیز بدلتے موسم کی
کتنے ہی لمحوں کو سسکتا چھوڑ گیا

ساری منڈیریں ویراں ویراں رہتی ہیں
جب سے شام نگر تو اپنا چھوڑ گیا

ڈنر پہ آج کوئی اس سا آشنا بھی نہ تھا
وہ اس سے پہلے اگرچہ کہیں ملا بھی نہ تھا

مجھے نہ جانے وہ سینے سے کیوں لگائے پھرے
میں کوئی گل بھی نہ تھا، موجۂ ہوا بھی نہ تھا

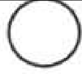
اسی نے آج بتایا مجھے کہ کون ہوں میں
وہ جس کو آج سے پہلے میں جانتا بھی نہ تھا

کہاں ہو، کیوں ہو، ہر اک سانس پوچھتی ہے مجھے
کبھی میں اپنے سوالوں میں یوں گھرا بھی نہ تھا

کسی کی میز پہ ہی رہ گئی، نہ جانے کیوں؟
وہ ڈائری کہ ابھی جس پہ کچھ لکھا بھی نہ تھا

تمام شہر صداؤں کے اک بھنور میں ہے
مرا مکان کبھی ایسے ڈولتا بھی نہ تھا

وہ جس کی دھن میں ہم اتوار کو بھی گھر نہ رہے
ملا تو اپنی طرف شام دیکھتا بھی نہ تھا



عمر گزری کہ تری دھن میں چلا تھا دریا
جابجا گھومتا ہے آج بھی پگلا دریا

بنتی جاتی ہیں گھر کتنی ہی بھولی یادیں
یہ مرا دل ہے کہ ٹھہرا ہوا گہرا دریا

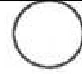
نہ کسی موج کا نغمہ ہے نہ گرداب کا رقص
جانے کیا بات ہے خاموش ہے سارا دریا

تھل کے سینے پہ پگھل جاتی ہے جب چاند کی برف
دور تک ریت پہ بہتا ہے سنہرا دریا

یہ ہواؤں کی پراسرار صدا ہانپتی شب
ہرطرف گونجتے سناٹے، یہ تنہا دریا

ہائے وہ رنگ بھرے پیار کے مسکن، پتن
ہائے وہ ناؤ سے رہ رہ کے لپٹتا دریا

شام آکاش پہ جب پھیلتا ہے دن کا لہو
ڈوب جاتا ہے کسی سوچ میں بہتا دریا



راتیں بھی سہانی ہوں تری دن بھی رنگیلے
کچھ روز تو جینا ہے تجھے موج میں جی لے

اِس پیاس کی شدت میں تو یہ بھی ہے غنیمت
آنکھوں سے ٹپکتا ہے جو پانی وہی پی لے

بہتی تھی ترے بام سے یوں چاندنی کل شب
گاتے ہوں غزل جیسے کوئی ہونٹ رسیلے

سوکھے ہوئے پتوں سے گزرتی تھیں ہوائیں
صحراؤں میں بھی گونجتے تھے گیت سریلے

اس دہر میں دم بھر کا بھروسہ بھی کہاں ہے
آتے ہوئے موسم سے جو لینا ہے ابھی لے

دن چل ہی دیا دور خلاؤں کے نگر میں
ہر چند کیے شام نے بھی سینکڑوں حیلے

اونے پونے غزلیں بیچیں، نظموں کا بیوپار کیا
دیکھو! ہم نے پیٹ کی خاطر کیا کیا کاروبار کیا

اس بستی کے لوگ تو سب تھے چلتی پھرتی دیواریں
ہم نے رنگ لٹاتی شب سے اجلے دنوں سے پیار کیا

ذہن سے اک اک کر کے تیری ساری باتیں اتر گئیں
کبھی کبھی تو وقت نے ہم کو ایسا بھی ناچار کیا

اپنا آپ بھی کھویا ہم نے، لوگوں سے بھی چھوٹا ساتھ
اک سائے کی دھن نے ہم کو کیسے کیسے خوار کیا

سارے عہد کا بوجھ تھا سر پر، دل میں سارے جہاں کا غم
وقت کا جلتا بلتا صحرا ہم نے جس دم پار کیا

جاگتی گلیوں، اونچے گھروں میں زرد اندھیرا ناچتا ہے
جس لمحے سے ہم ڈرتے تھے اس نے آخر وار کیا

شام کی ٹھنڈی آہوں میں بھی تیری خوشبو شامل تھی
رات گئے تک پیڑوں نے بھی تیرا ذکر اذکار کیا

پت جھڑ کو جو بہار کا موسم نہ کہہ سکے
وہ لوگ تیرے شہر میں پاگل گنے گئے

اے میرے دوست پھر کوئی قربت کا بند باندھ
خود محویت کی رو تو بہا لے چلی مجھے

شب کو تو چاند اور ستارے تھے ساتھ ساتھ
ٹھہرا مگر نہ کوئی بھی سورج کے سامنے

ق

بجلی ڈرا رہی ہے مجھے چیخ چیخ کے
بادل بھی بار بار لگاتے ہیں قہقہے
بیٹھا ہوں پھر بھی دیر سے اِس انتظار میں
چاند آئے گا گھٹاؤں کی دیوار پھاند کے

ق

اجڑے گھروں میں گھومتے سایو! ذرا سنو
وہ قہقہے۔ وہ چاندنی سے شوخ قہقہے
وہ فصل گل کی صبح سے خوشبو اڑاتے سانس
وہ سردیوں کی دھوپ سے چہرے کہاں گئے

محمود شامؔ جھنگ کا پھیرا بھی ہو کبھی
لاہور کی ہوا ہی بہت بھا گئی تجھے

جب سے وہ رنگتوں کا ہیولا جدا ہوا

گہنا گیا ہے پیار کا میلہ بھرا ہوا

ہائے وہ نرم نرم ہوا جھومتے درخت

جس طرح چل رہا ہو کوئی اونگھتا ہوا

بجھتے چراغ، ہانپتی شب، ادھ کھلے کواڑ

ایسے میں کون ہے یہ سر رہ کھڑا ہوا

اب وہ گداز چھاؤں ہے، نہ آہٹوں کی گونج

میرے نگر کے راستو! یہ تم کو کیا ہوا

سینوں کے دشت میں ہیں امنگوں کے قافلے

آنکھوں میں خواہشات کا دریا رکا ہوا

تیرا خیال، رینگتے لمحے، اداس شام

سایوں کا رقص، دل کا دریچہ کھلا ہوا

کتنے در وا ہیں، کہیں آنکھ ملائیں تو سہی
اس نئے شہر سے کچھ ربط بڑھائیں تو سہی

کسی خوشبو کے تعاقب میں چلیں گام دو گام
دھیان میں چاندنی کا شہر بسائیں تو سہی

کچھ تو کہتی ہے سرِشام سمندر کی ہوا
کبھی ساحل کی خنک ریت پہ جائیں تو سہی

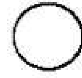
کیا خبر اوٹ میں ہوں اس کی مناظر کیا کیا
اپنے پندار کی دیوار گرائیں تو سہی

دل کے اوراق پہ اب تازہ حکایات لکھیں
نئے لمحوں میں نیا خون رچائیں تو سہی

اپنے بکھرے ہوئے ذروں کو سمیٹیں پھر سے
بزم پھر رقصِ تمنا کی سجائیں تو سہی

شام یہ روشنی، یہ رنگ کے پھیلے ہوئے جال!
اک ذرا ان کے طلسمات میں آئیں تو سہی

(1967ء۔ کراچی آنے کے بعد پہلی غزل)



شب تنہائی ہے، اس قرب کا احساس بھی ہے
دھیان میں پھیلی، جواں بازوؤں کی باس بھی ہے

دل کا اک ایک ورق اس نے جھلس ڈالا ہے
یہ سلگتا ہوا موسم کہ مجھے راس بھی ہے

ٹوٹ سکتا ہے شب تار کی ظلمت کا حصار
اک علاج اس کا شب تار کا احساس بھی ہے

یہ یقیں ہے کہ سبھی پھول ہیں کاغذ کے مگر
تیرے وعدوں، تری قسموں کا مجھے پاس بھی ہے

ڈھل گئے ہیں وہ حسیں جسم گئے لمحوں میں
گردش وقت میں اب گرمی انفاس بھی ہے

اپنے بکھرے ہوئے ذروں کو لیے پھرتا ہوں
ان دنوں اپنا یہ بحران مجھے راس بھی ہے

شام اس شہر میں کیسے نہ لگے دل کہ جہاں
رنگ کے سیل رواں اور ہمیں پیاس بھی ہے

○

مدتوں بعد وہ گلیاں وہ جھروکے دیکھے
جسم کی راکھ سے اٹھتے ہوئے شعلے دیکھے

دل میں درآئیں گئی ساعتیں خوشبو بن کر
صدیوں کی نیند سے پھر جاگتے لمحے دیکھے

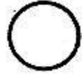
رنگ برساتی وہی صبح، وہی بھیگتی شام
وہی احساس میں ڈوبے ہوئے سائے دیکھے

ایک اک موڑ ملے بچھڑے خیالوں کے ہجوم
سونے دروازوں میں پھر چاند سے چہرے دیکھے

ایک اک آنکھ پہ لمحوں کا فسوں طاری ہے
کون اس وقت کی دیوار سے آگے دیکھے

تہ میں بستے ہیں چمکتے ہوئے رنگوں کے نگر
کوئی اس گھور اندھیرے میں اتر کے دیکھے

شامؔ جب توڑ لیا اس سے تھا جو بھی رشتہ
اپنے اظہار کے پھر کتنے ہی رستے دیکھے



ٹوٹے ہیں کیسے خواہشوں کے آئینوں کو دیکھ
پلکوں کی تہ میں بکھری ہوئی کرچیوں کو دیکھ

میں ہوں ترا ہی عکس، مرے رنگ پر نہ جا
آنکھوں میں جھانک اپنی ہی تنہائیوں کو دیکھ

یہ آسماں کے بدلے ہوئے رنگ غور کر
ان موسموں کے بپھرے ہوئے تیوروں کو دیکھ

سن تو در خیال پہ فردا کی دستکیں
خود کا حصار توڑ کے جاتی رتوں کو دیکھ

گلیوں میں گھومتی ہیں ہزاروں کہانیاں
چہروں پہ نقش وقت کی پہنائیوں کو دیکھ

اک اک پلک پہ چھائی ہے محرومیوں کی شام
ضبط سخن کی آگ میں جلتے لبوں کو دیکھ

کہتی ہے شام کچھ تو مکانوں کی خامشی
بے مدعا نہیں ہیں، کھلے روزنوں کو دیکھ

کس کو ہوگا ترے آنے کا پتا، میرے بعد
کون سن پائے گا لمحوں کی صدا، میرے بعد

جس سے یادوں کے شبستان مہک اٹھتے تھے
اسی خوشبو کو ترستی ہے صبا، میرے بعد

میں تو اک رقص تھا کچھ رنگ بھرے ذروں کا
راز یہ اہل زمانہ پہ کھلا، میرے بعد

بام و در چیختے ہیں رینگتی تنہائی میں
شہر میں خاک اڑاتی ہے ہوا، میرے بعد

حال دل کس سے کہے، کس سے لپٹ کر روئے
شہر در شہر بھٹکتی ہے گھٹا، میرے بعد

کوئی سنتا نہیں ویران پڑے ہیں کمرے
سر پٹختی ہے کواڑوں سے ہوا، میرے بعد

شام کے سنگ سے ہی چاندنی شب پھوٹے گی
دربدر پھیلتی جائے گی ضیا میرے بعد

گنگ جذبات کو بہتا ہوا دریا نہ کیا
"میری آنکھوں نے ترے راز کو رسوا نہ کیا"

کون خوشبو تھی کہ جس کے لئے دردر نہ پھرے
ہم نے اس شہر میں کس سائے کا پیچھا نہ کیا

اسکی آنکھوں میں بھی رقصاں تھا وہی درد کا رنگ
ہم تو پھر چپ ہی رہے کوئی بھی شکوا نہ کیا

ڈھونڈ وہ راز کسی رینگتی خاموشی میں
جس کو الفاظ کے ہنگاموں نے افشا نہ کیا

شہر میں آئے تو تنہائی کا احساس بڑھا
دشت میں تھے تو تری یاد نے تنہا نہ کیا

دستکیں دیتے رہے شام دہکتے موسم
ہم نے کیا جانیے دروازہ دل وا نہ کیا

○

شہروں کا شور کرگیا ہے بے خبر مجھے

میں کون ہوں؟ بتا تو سہی میرے گھر مجھے

ان رنگتوں کی اوٹ سے باہر نکل کے مل

خالی چمک، دمک سے ہی مت رام کر مجھے

میں اور ہوگیا ہوں کہ دنیا بدل گئی

حیرت سے تک رہے ہیں سبھی بام و در مجھے

کھینچے پھرے ہیں شہر کی سڑکیں تمام دن

ڈستی ہے چارپائی مری، رات بھر مجھے

میں دور ہوگیا ہوں، بہت اپنے آپ سے

اب اور تیز روشنی! گھائل نہ کر مجھے

○

تا دور گونجتی تھیں ہواؤں کی سسکیاں

ڈسنے کو آرہی تھی ہر اک رہگزر مجھے

دن کے لہو میں غرق تھا آکاش کا بدن

بھولی نہیں ہے شام وہ شامِ سفر مجھے

بس ایک اپنے ہی قدموں کی چاپ سنتا ہوں

میں کون ہوں کہ بھرے شہر میں بھی تنہا ہوں

جہاں میں جسم تھا، تو نے وہاں تو ساتھ دیا

وہاں بھی آ کہ جہاں میں تمام سایا ہوں

وہ ایک موڑ بھی اس رہ پہ آئے گا کہ جہاں

ملا کے ہاتھ تو بولے گا ''میں تو چلتا ہوں''

تری جدائی کا غم ہے، نہ تیرے ملنے کا

میں اپنی آگ میں دن رات جلتا رہتا ہوں

گئے وہ روز کہ تو باعث قرار تھی جب

تری جھلک سے بھی اب تو اداس ہوتا ہوں

مرے بغیر ہے ممکن کہاں تری تکمیل

مجھے پکار! کہ میں ہی ترا کنارا ہوں

کبھی تو ڈوب سہی شام کے سمندر میں

کہ میں سدا ہی جواہر نکال لایا ہوں

تارے کیا ہیں، چاندنی کیا ہے

سب ہی رنگوں کا دھوکا ہے

میں بھی دن دن بکھر رہا ہوں

تو بھی خاصا ٹوٹ گیا ہے

میں جیسے خالی کمرہ ہوں

کچھ ایسے اس نے دیکھا ہے

اپنے اندر کا جنگل بھی

اب کتنا گنجان ہوا ہے

خالی ڈبیاں گھوم رہی ہیں

اور سگریٹ کا کال پڑا ہے

گرم خون کا سرخ سمندر

اب تو مجھے ڈبونے لگا ہے

شامؔ جی!! اکثر اپنا آپ ہی رستے کی دیوار بنا ہے

راستے اپنے لئے تھے، ہم مگر اپنے نہ تھے

دوریاں کچھ بھی نہیں تھیں، ہم ہی پاس آتے نہ تھے

سب تھے سورج کی دہکتی آنکھ سے دہشت زدہ

ورنہ دل میں پیار کے کیا کیا کنول کھلتے نہ تھے

دھیمی نظریں داستانوں کو جنم دیتی رہیں

پیاس کی شدت تھی اتنی خشک لب ہلتے نہ تھے

چاندنی تھی، ریت تھی، ٹھنڈی ہوا کا لمس تھا

سوچتا ہوں دل کے دروازے ہی کیوں کھلتے نہ تھے

آنکھ میں رنگت نہ تھی اور پھول میں خوشبو نہ تھی

دھوپ نے ان آٹھ دن کیا کیا ستم ڈھائے نہ تھے

جسم کے اوراق پہلے بھی جلے تھے بارہا

ہر قدم یوں شہر میں لیکن کبھی بکھرے نہ تھے

دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا چند روز

شاؔم صاحب اپنے اندر ڈوب کر ابھرے نہ تھے

(شعبہ فلسفہ کے ایک آٹھ روزہ سفر کا تاثر)

لکھ اپنی ڈائری میں کبھی میرا نام بھی

ان رنگ رنگ لفظوں میں اک سادہ نام بھی

دن تھے کہ تیری کار کا نمبر بھی یاد تھا

اب ہیں کہ ہم کو بھول گیا اپنا نام بھی

گرمی تھی وہ مکان کا سب کچھ جھلس گئی

دل کا ورق بھی راکھ ہوا، اس کا نام بھی

کل رات چومتا تھا ترے ہونٹ بار بار

پیاسا تھا سخت میری طرح میرا نام بھی

اس سے ہی زندگی ہے مرے خوں کے شہر میں

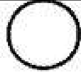
برفیلی خواہشوں میں ہے اک جلتا نام بھی

وہ بھوک تھی میں اپنے ہی اندر کو کھا گیا

ملتا نہیں ہے دور تلک میرا نام بھی

محمود شامؔ پوچھتے ہیں سب ''وہ'' کون ہے

تم ہی کہو کہ ہوتا ہے خوشبو کا نام بھی



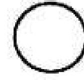
وقت کے کتنے ہی دھاروں سے گزرنا ہے ابھی
زندگی ہے تو کئی رنگ سے مرنا ہے ابھی

کٹ گیا دن کا دہکتا ہوا صحرا بھی، تو کیا
رات کے گہرے سمندر میں اترنا ہے ابھی

ذہن کے ریزے تو پھیلے ہیں فضا میں ہر سو
جسم کو ٹوٹ کے ہر گام بکھرنا ہے ابھی

یہ سجے بام...... جواں چاندنی۔ یوں لگتا ہے
اک ستم اور ترے شہر نے کرنا ہے ابھی

ایک اک رنگ اڑا لے گئی بے مہر ہوا،
کتنے خاکے ہیں جنہیں شامؔ جی بھرنا ہے ابھی



دل میں جب تیری لگن رقص کیا کرتی تھی
میری ہر سانس میں خوشبو سی بسا کرتی تھی

اب تو محفل سے بھی ہوتا نہیں کچھ غم کا علاج
پہلے تنہائی بھی دکھ بانٹ لیا کرتی تھی

اب جو رقصاں ہے کئی رنگ بھرے چہروں میں
یہی مٹی کبھی بے کار اڑا کرتی تھی

رنگ کے جال ہی ملتے ہیں جدھر جاتا ہوں
روشنی یوں نہ مجھے تنگ کیا کرتی تھی

اب مجھے چاندنی کچھ بھی تو نہیں کہتی ہے
کبھی یہ تیرے سندیسے بھی دیا کرتی تھی

کس قدر پیار سے یہ پیڑ بلاتے تھے مجھے
کس طرح چھاؤں ترا ذکر کیا کرتی تھی

یہ در و بام کبھی شام لپٹتے تھے مجھے
ہر گلی بڑھ کے قدم چوم لیا کرتی تھی

موسم وہ رنگ بُو گئے ہیں

فٹ پاتھ باغ ہو گئے ہیں

آئے ہیں آندھیاں جو بن کر

مثلِ ہوا ہی وہ گئے ہیں

اے دل! بکھیر کچھ اندھیرا

ہم روشنی میں کھو گئے ہیں

آنکھیں...... پکارتے سمندر

اکثر مجھے ڈبو گئے ہیں

آواز دو کہ "شام صاحب

کن پانیوں میں کھو گئے ہیں"

اتوار بھی ہے اک قیامت

لمحے کہ سال ہو گئے ہیں

محمود شامؔ اب چلو گھر

رستے بھی سارے سو گئے ہیں

موسم نے دریچوں میں عجب رنگ بھرا ہے

ہر ایک مکاں چاندنی کا شہر بنا ہے

خواہش کے نگر میں بھی کبھی رنگتیں بکھرا

تیرے لیے مدت سے یہ دروازہ کھلا ہے

کس کے لیے ہو؟ کون ہو؟ کیا شے ہو؟ کہاں ہو؟

صدیوں سے مرا سایا مجھے پوچھ رہا ہے

ہر شخص ہے اب اپنے ہی احساس سے عاری

ہر لفظ بھی اب اپنے معانی سے جدا ہے

سہمے ہوئے بازار ہیں، اترے ہوئے چہرے

اس خوشبوؤں کے شہر کو کیا ہونے لگا ہے

ملنے کو ہیں بے تاب کناروں پہ گھنے پیڑ

دریا مگر اپنے ہی تماشے میں گھرا ہے

چنتا ہوں کئی روز سے میں کرچیاں اپنی

بے طرح مجھے شام کوئی توڑ گیا ہے

اڑتی ہے دل کے فرش پہ بیتے دنوں کی راکھ
میں ہوں ترا خیال ہے اور سگرٹوں کی راکھ

بدلا جو سال ہم کو بھی سب نے بھلا دیا
ہم تھے کہ گزرے سال کے کیلنڈروں کی راکھ

گلیاں بھی سوچ میں ہیں، دریچے بھی محو ہیں
وہ کون تھا بکھیر گیا جو دلوں کی راکھ

سب رنگتیں بجھا گئی ہے وقت کی ہوا
دل میں چھپائے پھرتے ہیں اب خواہشوں کی راکھ

وہ لمحہ کون سا تھا کہ جس کو نہ روئے ہم
اب تک پلک پلک ہے سجی آنسوؤں کی راکھ

پھر وہ گلی ہے، شام ہے، تنہائیوں کا رقص
پھیلی ہے آس پاس کئی آہٹوں کی راکھ

○

آنکھ کے شیشوں میں پہلے روشنی اتنی نہ تھی
شکل کوئی رنگ میں لپٹی ہوئی اتری نہ تھی

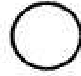
اس طرح دیکھی تھی اپنی بے طرح حالت کہاں
ڈولتی تھی جسم کی دیوار پر گرتی نہ تھی

مدتوں سے جانتے تھے ایک دوجے کو مگر
میں نہ ٹوٹا تھا کبھی اور وہ بھی یوں بکھری نہ تھی

روشنی تھی تیز ایسی کھو گئے سب راستے
کوئی دروازہ نہیں تھا اور کوئی کھڑکی نہ تھی

گھوم پھر کر مال پر، جب رات ہم لوٹے تھے مگر
اک کرن دہلیز سے لپٹی تھی، کچھ کہتی نہ تھی

ایک خوشبو کے بھنور میں ڈوبتا جاتا ہے دل
شاؔم صاحب دھیان کی ندی ہی کم گہری نہ تھی



ملتا نہیں نظروں کو ہیولوں کے سوا کچھ
یوں ٹوٹ کے بکھرا ہوں کہ باقی نہ رہا کچھ

بے معنی تو ہوتی نہیں گلیوں کی خموشی
کہتے ہیں در و بام کہ پل بھر میں ہوا کچھ

ڈھل جائے گی اب شہر کے ماتھے کی سیاہی
پھرتی ہے لیے رنگ نئی رت کی ہوا کچھ

ٹھٹھری ہوئی صبحیں، تو کبھی جلتی دوپہریں
اک بس کو جو دیکھا ہے تو یاد آیا ہے کیا کچھ

خواہش تھی بڑی دیر سے میں تجھ کو بھلا دوں
یہ کام بھی دیکھا ہے کہ دشوار نہ تھا کچھ

نظر کسی کی نظر سے نہیں الجھتی تھی
وہ دن بھی تھے کہ یونہی زندگی گزرتی تھی

ستارے اپنے لیے خواہشوں کی منزل تھے
حسین رات ہمیں چاندنی پلاتی تھی

رہے تھے اپنی ہواؤں میں ایک عمر مگر
بکھر پڑے تو ہر اک گام اپنی ہستی تھی

یہی بہت تھا کہ کچھ لوگ آ کے کہتے تھے
وہ میرا ذکر بہت مخلصانہ کرتی تھی

نظر میں پیار بھی تھا اور تکلفات بھی تھے
کہا کریں گے کبھی ہم عجیب لڑکی تھی

خموش رہتی تھیں گہرے سمندروں کی طرح
وہ آنکھیں جن سے نری شاعری بکھرتی تھی

اسے ملے تو پھر اس بات کا سراغ ملا
ہمیں یہ زندگی کیوں اتنی پیاری لگتی تھی

نہ جانے کتنے ہی صفحوں پہ دل بکھیرا مگر
نہ کہہ سکے تو وہ اک بات ہی جو کہنی تھی

مہک تو اس کے ہر اک پیرہن میں تھی لیکن
وہ گھر کے سادہ سے کپڑوں میں خوب لگتی تھی

روز و شب کی شاخ سے بچھڑا ہوا پتا ہوں میں

وقت بھی اب ڈھونڈتا ہے جس کو وہ لمحہ ہوں میں

دل کے شیشے ٹوٹ جاتے ہیں مری آواز سے

اک شکستہ ساز سے ابھرا ہوا نغمہ ہوں میں

ہم نشینوں کو کبھی آتی نہیں ہے آنچ تک

کتنی ٹھنڈی آگ ہے، جس میں سدا جلتا ہوں میں

زندگی کے شور میں سمٹے رہے ذرے مرے

اک ذرا تنہا ہوا تو کس طرح بکھرا ہوں میں

رنگوں کا سیل تھا یا خوشبوؤں کی لہر تھی

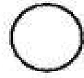
اب تلک اس حسن میں، اس جھیل میں ڈوبا ہوں میں

ان چمکتی شاہراہوں پر کسے اپنا کہوں

شہر ہیں آباد اپنوں سے مگر تنہا ہوں میں

شام یوں تو اب خلاؤں میں ہیں اپنی منزلیں

اور دیکھوں تو اسی دھرتی سے بے رشتہ ہوں میں



آواز میں عجب کھنک ہے
کانوں سے نشہ دل تلک ہے

کتنے ہی دل ہیں اس سے روشن
آنکھوں میں تیری جو چمک ہے

وہ موج موج سیمیں پیکر
شاخ گلاب کی لچک ہے

حد نظر تک آئینے ہیں!
اپنا ہی عکس دور تک ہے

کب ملا، کون ملا، اور کہاں بھول گئے
دل کی ویرانیاں، آنکھوں کا دھواں بھول گئے

اس کا ہر نقش مٹا ڈالا ہے لوح دل سے
گفتگو، لہجہ، زباں، طرز بیاں بھول گئے

اب کہاں یاد کہ وہ باد صبا تھی کہ نسیم
فرط مستی سے لپٹنے کا سماں بھول گئے

شہر والوں کو سناتی تھی سرشام ہوا
درد کے گیت، اداسی کی زباں بھول گئے

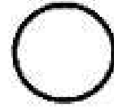
رنگ بکھرے تھے نگاہوں میں طلب کے کیا کیا
جگمگاتا تھا خیالوں کا جہاں بھول گئے

اتنے زوروں پہ تھے کچھ وقت کے رنگوں کے بھنور
تیری صورت، تری یادوں کے نشاں بھول گئے

اس قدر ضبط کہ الفاظ ہوئے بے معنی
اتنی خاموشی کہ انداز فغاں بھول گئے

وہ اجالا ہے، دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی
وہ تماشا ہے کہ ویرانۂ جاں بھول گئے

وہ صدا اب بھی الٹ دیتی ہے اس دل کا سکوں
لاکھ ہم لہجہ، زباں، طرز بیاں بھول گئے



تم پھول تھے، خوشبو تھے کہ اک موج ہوا تھے

اس دل میں بسے رہتے ہو، کیا جانیے کیا تھے

لوگوں کے جلو میں تھے مگر آنکھ سے اوجھل

ہم شہر میں پھیلی ہوئی بے رنگ ہوا تھے

لاکھ اب یاد کی، احساس کی پہنائی ملے

ان خلاؤں میں کہاں جسم سی رعنائی ملے

اتنے ارزاں تو کبھی ہم نہ ہوئے تھے اب تک

جس طرف جائیں، وہیں اپنی شناسائی ملے

بس گئے ہیں وہ خدوخال نظر میں ایسے

اب تو ہر شکل میں اس شکل کی پرچھائی ملے

محفلیں اتنی بڑھیں، بھول گئے اپنا وجود

اب تو کہتے ہیں گھڑی بھر ہی کو تنہائی ملے

ان کے ہونٹوں سے بھی میری ہی کہانی ابھرے

ان درختوں کو اگر قوت گویائی ملے

کتنے خالی ہوئے دامان نظر، جیب خیال

اب تو ڈھونڈے سے بھی یادوں کی نہ پرچھائی ملے

کوئی بھی ہو نہ سکا میرے بکھرنے میں شریک

شامؔ اس شہر میں سب لوگ تماشائی ملے

پہلے سے اب وہ رنگ، وہ میلے کدھر گئے

ہوتی تھی جن سے دھوم وہ جذبے ہی مر گئے

آنکھوں کا نور، دل کا اجالا بھی لے اڑے

ہم کو تو اپنے دوست ہی سنسان کر گئے

ہائے وہ چھاؤں ڈالتے چھتنار کیا ہوئے

ہائے وہ پاؤں چومتے دریا اتر گئے

اک لحہ تیری یاد سے غافل ہوئے تھے ہم

اک لمحے میں ہی کتنے زمانے گزر گئے

اک شب زدہ کی چیخ تھی، کوئی گجر نہ تھا

آواز سی جو ہم نے سنی تھی، سحر گئے

کوئی نہ شب کی تیرگی میں ساتھ دے سکا

کچھ دے گئے فریب تو کچھ یونہی ڈر گئے

ہم رہ گئے ہیں شام جو تنہا تو غم نہیں

کب اہل دل کے ساتھ بھلا کم نظر گئے

ایسے چپ چپ بھی کیا جیا جائے
اب کہیں عشق ہی کیا جائے

دل کے شیشے پہ ہے غبار بہت
آج کچھ دیر رو لیا جائے

اجنبی شہر، بے نمک چہرے
کسے ہم رازِ دل کیا جائے

جسم کی پیاس ہے بجھے گی کہاں
آبِ حیواں ہی گو پیا جائے

دل ہے ویران، شہر بھی خاموش
فون ہی اس کو کرلیا جائے

ایک دیوارِ جسم باقی ہے
اب اسے بھی گرا دیا جائے

ہوگیا تار تار ہر منظر
شامِ چاکِ نظر سیا جائے

گھر گیا ہوں بے طرح میں خواہشوں کے درمیاں
جسم کے ریزے اڑاتی آندھیوں کے درمیاں

کتنے چہرے، کتنی شکلیں، پھر بھی تنہائی وہی
کون لے آیا مجھے ان آئینوں کے درمیاں

ہم کہاں یارو، کہاں وہ موجۂ بادِ نسیم
وقت کی پہنائیاں حائل دلوں کے درمیاں

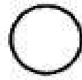
دل پہ گزری جو، وہ گزری، شہر کیوں ویراں ہوئے
ایک دہشت سی ہے پھیلی راستوں کے درمیاں

مدعا پنہاں پس الفاظ ہے، جو پڑھ سکو
کچھ نہیں پاؤ گے تم ان سرخیوں کے درمیاں

جیسے خوشبو شہر میں، صحرا میں جیسے چاندنی
یوں بکھر جاتا ہوں میں تنہائیوں کے درمیاں

جس کی خاطر شعر لکھتے ہو، کبھی پڑھتی بھی ہے
کب تلک الجھے رہو گے قافیوں کے درمیاں

شامؔ جی بکھرے کبھی اس دل کے آنگن میں مہک
زندگی گزرے گی کب تک آہٹوں کے درمیاں



ہر اک گھڑی بکھر رہا ہوں میں وقت ہوں، گزر رہا ہوں

لوگوں کے دل میں جانے کب سے بن بن کے غم اتر رہا ہوں

چہروں پہ ہے مری کہانی ہر آنکھ میں بکھر رہا ہوں

لے آئی زندگی کہاں پر اپنی صدا سے ڈر رہا ہوں

شہروں میں آدمی بہت ہے انساں تلاش کر رہا ہوں

حالات پھر بگڑ گئے ہیں اور میں کہ پھر سنور رہا ہوں

انجام کی مجھے خبر کیا طوفان ہوں، بپھر رہا ہوں

غرقاب ہوگئے معانی الفاظ کا بھنور، رہا ہوں

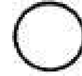
سہمے ہوئے ہیں سارے رستے ڈر ڈر کے پاؤں دھر رہا ہوں

لاکھوں ہی رنگتوں میں اک میں بے رنگ ہوں، ابھر رہا ہوں

دنیا بہت بدل گئی ہے میں بھی تو میں کدھر رہا ہوں

خاموش ہوگیا زمانہ خود سے کلام کر رہا ہوں

یوں جی رہا ہوں شام جیسے
کوئی گناہ کر رہا ہوں

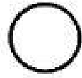


موج نسیم لے اڑی تھی　　خوشبو کا ہم سفر رہا ہوں

ہنگامہ حیات سے دور　　یادوں کے دوش پر رہا ہوں

کتنے ہی وقت مجھ پہ بیتے　　صدیوں کی رہگزر رہا ہوں

اب بھی مہک ہے اس کی دل میں
اب بھی نکھر نکھر رہا ہوں



اب نہ بولو گے تو پھر بول نہ پاؤ گے کبھی
وقت کے جال سے باہر نہیں آؤ گے کبھی

لفظ کے لمس کو ہر ایک زباں ترسے گی!
اتنی بھی مہلت اظہار نہ پاؤ گے کبھی

اب جہاں گوش برآواز ہے، خاموش ہو تم
در و دیوار کو فریاد سناؤ گے کبھی

تپتے صحراؤں میں بھٹکو گے بگولے بن کر
خود ہی بستے ہوئے گھر بار جلاؤ گے کبھی

لے اڑیں گی جو ہوائیں، تو پکارو گے ہمیں
برگ آوارہ ہیں، بچھڑے تو نہ پاؤ گے کبھی

اڑتی خوشبو ہیں، بکھرتے ہی رہیں گے ہم تو
بے ارادہ ہی سہی، دل میں بساؤ گے کبھی

شام جی رنگ لٹاتی ہوئی آئے گی نسیم
اک ذرا پیار سے تم جب بھی بلاؤ گے کبھی

چاندتارے جب اس آنگن سے گزرتے ہوں گے

شام وہ لوگ ہمیں یاد تو کرتے ہوں گے

ایک یہ صبح کہ ویراں ہے گزرگاہ خیال

ایک وہ صبح جہاں بال سنورتے ہوں گے

جب کبھی چوڑیاں ٹکرا کے کھنکتی ہوں گی

گھر کی تنہائی میں کیا رنگ بکھرتے ہوں گے

گدگداتا تو انہیں ہوگا کبھی اپنا خیال

ان کے ہونٹوں پہ بھی کچھ گیت ابھرتے ہوں گے

پڑتی ہوگی جو کبھی فون پہ بھولے سے نظر

بیتے لمحے انہیں بے چین تو کرتے ہوں گے

پگلی یادیں انہیں آلیتی تو ہوں گی یک بار

بھولے رستوں پہ کبھی پاؤں جو دھرتے ہوں گے

ایک یہ شام کہ بھیگی ہوئی پلکیں ہیں وہی

ایک وہ شام جہاں چاند اترتے ہوں گے

جن کی چاہ میں ہم حیران و پریشاں پھرتے ہیں

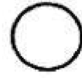
دیکھیں اپنی جانب، کب وہ نیناں پھرتے ہیں

بستی بستی تنہائی کی آگ سلگتی ہے!

جگ جگ جیون کھائے لوگ ہراساں پھرتے ہیں

بکھر گئے ہیں عقل و خرد کے شیرازے

کتنے دانشور اب چاک گریباں پھرتے ہیں



مل سکے تم نہ...... مقدر اپنے
ہم سے بچھڑے بھی تو ہو کر اپنے

وقت، احساس فنا، کرب حیات
کس قدر بوجھ ہیں دل پر اپنے

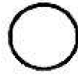
ٹوٹ جاتے ہیں، بکھر جاتے ہیں
کانچ کے گھر ہیں مقدر اپنے

زندگی ہوگئی لمحوں کی اسیر
وقت نے کاٹ دیئے پر اپنے

جگمگاتا ہی رہا شہر خیال
دل جلائے ہیں برابر اپنے

اجنبی پیار سے ملتے ہیں سدا
بھول جاتے ہیں تو اکثر اپنے

دل بھی ویراں ہوا، آنکھیں خالی
شام لوٹے گئے سب گھر اپنے



ہونٹ کھولے ہوئے خاموش دریچے دیکھو
وقت ہے، چاند ابھی نکلے کہ نکلے، دیکھو

شہر میں گھومو تو رنگوں کے جلو میں لیکن
گھر میں آؤ تو وہی رینگتے سائے دیکھو

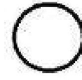
اپنے ذروں کے طلسمات میں کھو جاؤ گی
کبھی تنہائی میں تم بھی تو بکھر کے دیکھو!

اپنی یادوں کی حسیں شاخ پہ رہنے دو ہمیں
ٹوٹ جاتے ہیں تو ملتے نہیں پتے دیکھو!

کبھی تم آخر شب وقت کی فریاد سنو!
صبح کے خوف سے لمحوں کو سسکتے دیکھو!

اک ذرا تیز چلی ہے جو ہوا، گرنے لگے
یہ فلک بوس محل ریت کے گھر تھے دیکھو!

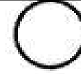
شام آئے تو کھلی چھت پہ نکل آؤ ذرا!
اپنی ہی آگ میں اس شہر کو جلتے دیکھو



تھک گئی زندگی مزدور کی بانہوں کی طرح
دل ہے ویران لٹے شہر کی راہوں کی طرح

اب پریشان ہے تو شور زمانہ سے...... مگر
کس نے ڈالی تھی بتا ایسے گناہوں کی طرح

زندگی اب تو ہر اک سانس پہ مانگے ہے خراج
عہد پارینہ کے خود ساختہ شاہوں کی طرح



مثال شمع جلاتی ہے زندگی ہم کو
کہ لمحہ لمحہ گھٹاتی ہے زندگی ہم کو
ہمارے جسم کے ذروں سے جو عبارت ہے
وہی کہانی سناتی ہے زندگی ہم کو

ہم اپنی آگ میں جل کر دوام پا بھی گئے،
عجب کہ اب جو بلاتی ہے زندگی ہم کو
بس ایک لمحے کی چوکھٹ پہ وارنے کیلئے
طرح طرح سے سجاتی ہے زندگی ہم کو

نہ کوئی چشمہ خواہش، نہ آبشار طلب
فقط سراب دکھاتی ہے زندگی ہم کو
بکھرنے لگتے ہیں جب رنگ اڑنے لگتے ہیں ہم
تھپک تھپک کے سلاتی ہے زندگی ہم کو

اداس شام کی آنکھوں میں، چاند کے دل میں
اسی کی شکل دکھاتی ہے زندگی ہم کو

سن سکے تو سن لے یہ آخری کہانی ہے
وقت کی صدا ہے یہ، وقت کی کہانی ہے

بھولنا بھی چاہوگی، تو بھلا نہ پاؤ گی
پیڑ پیڑ پر لکھی اب مری کہانی ہے

اہل دل ہی کہتے ہیں، اہل دل ہی سنتے ہیں
چاند ایک نغمہ ہے، چاندنی کہانی ہے

زرد زرد چہرے ہیں، سرخ سرخ آنکھیں ہیں
اس نگر کا ہر باسی، ان کہی کہانی ہے

رنگ رنگ کوچوں میں، پھول پھول گلیوں میں
تیرا ہی فسانا ہے تیری ہی کہانی ہے

شام اتنی جلدی کیوں لوگ بھول جاتے ہیں
کل ہی کا تو قصہ ہے، کل ہی کی کہانی ہے

سفید ساڑھی سے چھنتا وہ مرمریں سا بدن
کہ جیسے دھند سے جھانکے سحر کی پہلی کرن
اب اتنا قرب ہوا، اس قدر شناسائی
کہ چاہیں تو نہیں پڑتی کبھی مجال سخن
اس ایک رنگ سے پھوٹے ہزار چشمہٗ رنگ
وہ میرا رنگ طلب ہو کہ تیرا رنگ بدن
پھر آج ہم کو ہے درپیش، خواہشوں کا سفر
سلگ رہی ہیں جو آنکھیں، تو جل رہا ہے بدن
متاعِ اہلِ نظر ہے وہ جلوہ بے نام
تمام عمر کا حاصل وہ بے نشاں سی چبھن
یہ شہر اپنے گناہوں کی پا رہا ہے سزا
گلی گلی ہے نحوست، مکاں مکاں ہے گھٹن
ٹھہر گیا ہے زمانہ، گزر رہا ہوں میں!!
یہ کس مقام پہ لے آئی، آج تیری لگن
ہوا کے بس میں ہیں لے جائیگی جدھر چاہے
جب اپنی شاخ سے بچھڑے تو خاک فکر وطن
لہو لہو ہیں ارادے، شکستہ پا ہیں خیال
کہ شامؔ اپنی انا کا سفر بہت ہے کٹھن

تو معمہ ہے تو حل اس کو بھی کرنا ہے مجھے

تو سمندر ہے تو پھر تہ میں اترنا ہے مجھے

تو نے سوچا تھا کہ جلووں سے بہل جاؤں گا

ایسے کتنے ہی سرابوں سے گزرنا ہے مجھے

قہر جتنا ہے تری آنکھ میں برسا دے مگر

اسی گرداب میں پھنس کر تو ابھرنا ہے مجھے

پھر بپا ہے وہی جذبات کا طوفان تو کیا

اسی بگڑے ہوئے موسم میں سنورنا ہے مجھے

ان دنوں چاند کی تسخیر کی ہے فکر کہ...... کل

چاندنی بن کے زمانے میں اترنا ہے مجھے

کس طرح چھوڑ دوں اس شہر کو اے موج نسیم

یہیں جینا ہے مجھے اور یہیں مرنا ہے مجھے

رک گیا وقت، پلٹ آئی ہیں بیتی صدیاں

یہی وہ لمحہ ہے جب شام بکھرنا ہے مجھے

کتنی شدت سے تجھے چاہا تھا
کبھی کچھ اور نہیں سوچا تھا

کھوئے تھے ایسے تری چاہت میں
ٹوٹ کے ابر جنوں برسا تھا

میری ہر سوچ میں تھی تیری ہی سوچ
میرا ہر لمحہ ترا لمحہ تھا

جب بھی پڑتے تھے خیالوں کے بھنور
تیرا چہرہ ہی ابھر آتا تھا

ان دنوں جسم کی رگ رگ میں رواں
خوں کہاں خواہشوں کا دریا تھا

یاد ہے آج بھی سانسوں کی مہک
وقت اپنے لیے رک جاتا تھا

جب چمکتا تھا بدن کا سورج
دھوپ بن کر میں بکھر جاتا تھا

ٹوٹ جاتا تھا زمانوں کا سکوت
دفعتہً شام کو فون آتا تھا

رنگ پیراہن احساس تھی تو
میں نگاہ طلب تشنہ تھا

تو نسیم سحر موسم گل!
میں کہ اک ٹوٹا ہوا پتا تھا

ریزہ ریزہ ہوا قصر پندار
بے طرح زور بدن ٹوٹا تھا

وار دی آج ترے در پہ انا
بوجھ صدیوں سے اٹھا رکھا تھا

راہیں، باہیں، تو دریچے آنکھیں
یہ ترا شہر بھی تجھ جیسا تھا

عمر بھر اپنے ہی شعلوں میں جلا
میں کہ سورج کی طرح تنہا تھا

گرم ہیں رنگ کے بازار یہاں
اتنا سناٹا کہاں ہوتا تھا

پاؤں نیچے سے زمیں بھی نکلی
میں خلاؤں کی طرف لپکا تھا

صبح کی طرح وہ بے رنگ ہے اب
شام کی طرح جسے چاہا تھا

انگ انگ جب جلا بدن کا
رنگ اور چمک اٹھا بدن کا

اب تک تھکن سے چور ہوں میں
مشکل تھا فلسفہ بدن کا

یوں گرد وقت کی پڑی تھی
دھندلا تھا آئینہ بدن کا

آنکھوں کے جام خالی خالی
ویراں ہے میکدہ بدن کا

اٹھی تھی خواہشوں کی آندھی
سپنا بکھر گیا بدن کا

اترا نہیں خمار اب تک
کتنا چڑھا نشہ بدن کا

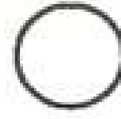
لمحے اداس، شام غمگیں
سورج کہاں گیا بدن کا

کبھی یہ بام ودر جسم یوں ہلے بھی نہ تھے
کہ خواہشوں کے یہ منہ زور سلسلے بھی نہ تھے

ملے تو ایسے کہ صدیوں کا ساتھ ہو جیسے
کسی کو بھولے تو جیسے کبھی ملے بھی نہ تھے

بکھر گئے ہیں فضا میں جدائیوں کے رنگ
وفا کے پھول ابھی شہر میں کھلے بھی نہ تھے

فصیل وقت کو غرقاب کر چکے ہوتے
دلوں کے اتنے تو گہرے معاملے بھی نہ تھے



ایک ہفتے کی ملاقات میں صدیوں کا سفر
جسم کی اجنبی منزل کو یہ روحوں کا سفر

بیتے دنوں کے دشت سے آتی صدا ہوں میں

اجڑے گھروں میں گھومتی پاگل ہوا ہوں میں

ہوں تو میں تیرے جسم کا سایا ہی کیا ہوا،

بس زندگی کی شام تلک ہی جدا ہوں میں

کیا جانے کب بگاڑ دے یہ سر پھری ہوا

بیتی ہوئی بہار کا اک نقش پا ہوں میں

یوں تو مرے بھی رنگ ہیں کچھ ان گنت مگر

ہر اک کو ایک رنگ نظر آ رہا ہوں میں

جانے وہ ایک لمحہ بھی کیا کیا بدل گیا

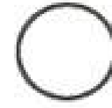
کیوں بار بار اپنی طرف دیکھتا ہوں میں

اک دن تری تلاش کی منزل بھی آئے گی

اب تک تو اپنے آپ کو ہی ڈھونڈتا ہوں میں

لپٹے ہوں جیسے شام کی چادر میں بام و در

کچھ یوں ترے خیال میں ڈوبا ہوا ہوں میں



کتنے سناٹوں سے گزری ہے جوانی اپنی
ایک گھمبیر خموشی ہے کہانی اپنی

جب بھی پائی ہے امنگوں نے کھلی تازہ ہوا
جس نے روک دی ہے بڑھ کے روانی اپنی

زندگی جس سے جاگتی ہے ابھی

وہ کہانی تو ان کہی ہے ابھی

راہ میں اور بھی ہیں کوہ گراں

ایک دیوار ہی گری ہے ابھی

جنبش لب ہی بن گئی طوفاں

سینکڑوں حرف گفتنی ہے ابھی

راحت نظر بھی ہے، وہ عذاب جاں بھی ہے
اس سے ربط لذت بھی اور امتحاں بھی ہے
فاصلے مٹے بھی ہیں اور کچھ بڑھے بھی ہیں
یہ سفر ضروری ہے اور رائیگاں بھی ہے
عمر بھر کی الجھن دے، ایک پل کا نظارہ
تیرا غم حقیقت بھی اور بے نشاں بھی ہے
تیری میٹھی باتوں میں، جھیل جھیل آنکھوں میں
آگ بھی سلگتی ہے، درد سے اماں بھی ہے
طے کریں تو ہم کیسے فاصلے دل وجاں کے
ایک یہ انا کا پل، اپنے درمیاں بھی ہے
لاکھ میں تجھے بھولوں، لاکھ تو مجھے بھولے
ایک رشتہ بے نام اپنے درمیاں بھی ہے
عشق دل میں طغیانی، برف آ کے ہونٹوں پر
سر پھری بھی ہے چاہت اور بے زباں بھی ہے
تیری زندگی سرگم، میری زندگی الجھن
رقص میں بھی ہے خواہش اور سرگراں بھی ہے
شاؔم جانے کیوں ہم نے سی لیا ہے ہونٹوں کو
ورنہ اپنے ہاتھوں میں وقت کی عناں بھی ہے

رات آئی ہے، گزر جائے گی
روشنی بن کے بکھر جائے گی

ہاں یونہی چاند کو تکتے رہنا
چاندنی دل میں اتر جائے گی

لذت درد بچا کر رکھنا
نکہت جاں ہے بکھر جائے گی

کرب کی آگ لگالو دل سے
کل خدا جانے کدھر جائے گی

اسی رستے پہ بہا اپنا لہو
اسی رستے سے سحر جائے گی

جسم کٹنا تھا پہ معلوم نہ تھا
یوں مری ذات بکھر جائے گی

میں نے جی بھر کے تجھے دیکھا ہے
اب تری شکل نکھر جائے گی

دل کی گہرائی میں گو اس کا ہی چہرہ ہوگا

اس کو وہ شخص کہاں یاد بھی آتا ہوگا

اب تری یاد کی جھکتی ہوئی شاخوں پہ کبھی

پھول کوئی نہ مرے نام سے کھلتا ہوگا

اپنے ہنگاموں سے مہلت کبھی مل جائے تو دیکھ

دھیان کی راکھ میں اک نام سلگتا ہوگا

تیرے احساس کی پھولوں بھری پگڈنڈی پر

ایک ٹوٹا ہوا پتا بھی سسکتا ہوگا

اپنے رنگوں کے تماشے سے نہ فرصت ہوگی

دوسرا رنگ نظر میں کہاں چھپتا ہوگا

پھیلتے جاتے ہیں ذرے مرے آنکھوں آنکھوں

اس طرح کون ترے درد میں بکھرا ہوگا

کتنی صدیاں سمٹ آئی ہیں اس شام میں دیکھ

وقت کو تو نے یوں پابستہ نہ دیکھا ہوگا

○

بکھری ہے اپنی ذات ہی نظروں کے سامنے
اک آئینہ دھرا ہے خیالوں کے سامنے

وارفتہ تھے حواس، بدن تھا ورق ورق
میں اک کھلی کتاب تھا لوگوں کے سامنے

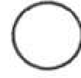
اک رشتۂ نظر تھا سو وہ بھی کٹا کٹا
چہروں کی ایک دھند تھی آنکھوں کے سامنے

ہر ذرہ اپنی ذات کا پالے ذرا شعور
سورج بھی پھر رکے گا نہ ذروں کے سامنے

اس کو گئے ہوئے تو زمانے گزر گئے
پھیلے ہیں اب بھی رنگ نگاہوں کے سامنے

پھر مہلت نگاہ ذرا، پیکر جمال!
پھر رقص میں ہیں خواہشیں جذبوں کے سامنے

کیوں ہوں، کہاں ہوں، کون ہوں اور کس لیے ہوں شام
مدت سے میں ہوں اپنے سوالوں کے سامنے



خیال چیختے ہیں، خواہشیں ترستی ہیں
کہاں ہے، جس کے لئے دھڑکنیں ترستی ہیں

ترے بدن کے جھلکتے ہی دوڑ جاتی تھی
اس ایک لہر کو اب تک رگیں ترستی ہیں

وہ گرم سانس، جواں لمس، تیز تیز مہک
کہ بسترے پہ پڑی سلوٹیں ترستی ہیں

عمارتوں نے ہر اک سمت سر اٹھائے ہیں
کہاں ہے پیاسی زمیں، بارشیں ترستی ہیں

وہ رنگ جس کے لئے شہر انتظار میں ہے
وہ شام جس کے لئے چلمنیں ترستی ہیں

پلکیں اجاڑ، دل ہے بجھا، روح سوگئی
روئے ہوئے بھی یارو، بہت دیر ہوگئی

اک وہ صدا تھی اپنے تو جینے کا حوصلہ
اس زندگی کے شور میں اب وہ بھی کھوگئی

آئی تو جیسے ہونے لگا مطلع غزل
بیٹھی تو جیسے نظم کی تکمیل ہو گئی

کہتے تھے اب نہ آئیں گے نظروں کے جال میں
موج نسیم ذہن سے ہر عزم دھو گئی

کھوئے ہیں اس کے سحر میں ہی اہل کارواں
اس کی نظر جو وقت سفر رنگ بو گئی

اف یہ دلوں میں پھیلے خلاؤں کی وسعتیں
کیسے کہیں خلاؤں کی تسخیر ہو گئی

میں ہوں شکار فتنۂ احساسِ رنگ شام
کس طرح ایک جسم کی تقسیم ہو گئی

یاد مجھے دلا گئی، میری وہ بے وفائیاں
آنکھ میں اس کی نقش تھیں، کتنی کٹھن جدائیاں

چہرے پہ کیا عذاب تھے، آنکھ میں کتنے خواب تھے
ہونٹ کھلی کتاب تھے، کہتے تھے سب کہانیاں

پھیلی تھی اس کے آس پاس، گہری اداسیوں کی باس
جھانک رہی تھی سخت پیاس، دہک رہے تھے جسم وجاں

پلکوں پہ گزری ساعتیں، لب پر گلے، شکایتیں
آنسوؤں میں حکایتیں، دھڑکنیں، سانس، سسکیاں

لفظ تھے کچھ کٹے کٹے، سانس بھی تھے بٹے بٹے
بال تھے گرد میں اٹے، چہرے پہ تھیں ہوائیاں

شام ہوا کی سسکیاں، دن کے لہو کی سرخیاں
درد بھری یہ داستاں، پھیلی ہیں سب کراں کراں

ابھی دکھائے گی منظر یہ زندگی کیا کیا
بکھیرتی ہے اندھیرے یہ روشنی کیا کیا

ہوا کی طرح تو ہر اک کی دسترس میں ہے
ترے فسانے سناتے ہیں لوگ بھی کیا کیا

برائے اہل تماشا، وصال تیشہ و سنگ
برائے اہل تمنا ہے تشنگی کیا کیا

وہ ایک پل کی ملاقات، عمر بھر کی خلش
بسا گیا ہے نظر میں وہ اجنبی کیا کیا

فریب عکس، تمنا کے رنگ، دھیان کی پینگ
کھلونے چھوڑ گیا ہے وہ آدمی کیا کیا

چمک اٹھے ہیں ستارے ہماری پلکوں پر
سجا گئی ہے منڈیروں پہ چاندنی کیا کیا

وفور نشہ سے چمکا ہے چاندنی سا بدن
چمن کھلاتی ہے یارو! یہ آگ بھی کیا کیا

ضمیر جبر مسلسل تو ذاتِ حبسِ دوام
سزائیں دیتی ہے دیکھو خود آگہی کیا کیا

وہ نین نقش تو غزلوں میں کب کے ڈھل بھی چکے
لکھو گے اور بھلا ان پہ شامؔ جی کیا کیا

O

کہاں تک اپنی انا کی کشاکشوں میں رہیں

کبھی تو مل کہ جنوں کی حکایتیں بھی کہیں

کبھی گرائیں تو پندار کا حصارِ گراں

کبھی تو ٹوٹ کے اک دوسرے کو ہم چاہیں

تری جدائی کا غم بھی نہ چھین لیں مجھ سے

گلاب چہرے، کھلے بال، رینگتی کاریں

○

مرے لیے تری نظروں کی روشنی ہے بہت
کہ دیکھ لوں تجھے پل بھر، مجھے یہی ہے بہت

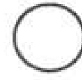
یہ اور بات کہ چاہت کے زخم گہرے ہیں
تجھے بھلانے کی کوشش تو ورنہ کی ہے بہت

کچھ اس خطا کی سزا بھی تو کم نہیں ملتی
غریب شہر کو اک جرم آگہی ہے بہت

کہاں سے لاؤں وہ چہرہ، وہ گفتگو، وہ ادا
ہزار حسن ہے گلیوں میں، آدمی ہے بہت

کبھی تو مہلت نظارہ، نکہت گزراں
لبوں پہ آگ سلگتی ہے، تشنگی ہے بہت

کسی نے ہنس کے جو دیکھا تو ہو گئے اس کے
کہ اس زمانے میں اتنی سی بات بھی ہے بہت



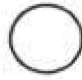
وہ آنکھ کہ پھر سوئی ہوئی چاہتیں جاگیں
پھر دل کے دریچوں پہ کئی دستکیں جاگیں

وہ ہونٹ کہ پھر پیاس چمکتی ہے لبوں پر
پھر کتنے زمانوں سے دبی خواہشیں جاگیں

وہ شکل کہ پھر نقش ابھرنے لگے دل پر
یادوں کے جزیروں میں بسی رنگتیں جاگیں

وہ سانس کہ پھر مہکے در و بامِ تمنا
خواہش کے خرابوں میں جواں نکہتیں جاگیں

وہ جسم کہ پھر تیز ہے تنہائی کا احساس
برسوں سے سلگتی ہوئی سب حسرتیں جاگیں



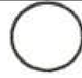
کچھ نظر آتا نہیں ہے، وہ اجالا کر دیا
سب ہی اپنا آپ بھولے، وہ تماشا کر دیا

کان بھی پڑتی نہیں ہے اب تو آوازِ ضمیر
کھوکھلے ذہنوں نے اتنا شور برپا کر دیا

ہاتھ خالی ہیں ہمارے اور کچھ ربِ جلیل
تو نے جو کچھ بھی لکھا تھا ہم نے پورا کر دیا

مسئلے جیسے چٹانیں، رہنما جیسے ہوا
وقت نے کتنے ،فلک بوسوں کو بونا کر دیا

چنتا پھرتا ہوں میں اپنے آپ کو ہی رات دن
زندگی نے یوں بکھیرا، ریزہ ریزہ کر دیا



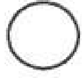
کچھ نظر آتا نہیں ہے، وہ اجالا کر دیا
سب ہی اپنا آپ بھولے، وہ تماشا کر دیا

کان بھی پڑتی نہیں ہے اب تو آواز ضمیر
کھوکھلے ذہنوں نے اتنا شور برپا کر دیا

ہاتھ خالی ہیں ہمارے اور کچھ رب جلیل
تو نے جو کچھ بھی لکھا تھا ہم نے پورا کر دیا

مسئلے جیسے چٹانیں، رہنما جیسے ہوا
وقت نے کتنے ،فلک بوسوں کو بونا کر دیا

چنتا پھرتا ہوں میں اپنے آپ کو ہی رات دن
زندگی نے یوں بکھیرا، ریزہ ریزہ کر دیا

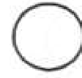


پھیلتا جاتا ہے اک لمحہ جو ڈھلتا ہی نہیں
وقت یوں ہم پہ رکا ہے کہ بدلتا ہی نہیں

مرحلے کتنے کڑے، کتنے کٹھن طے بھی ہوئے
پھر بھی اک خوف، عجب خوف کہ ٹلتا ہی نہیں

ایک یہ آنکھ، جو ہر رنگ میں کھو جاتی ہے
ایک یہ دل جو کسی طور بہلتا ہی نہیں

لوگ آہٹ پہ ہی آجاتے تھے گلیوں میں کبھی
اب تو چیخیں بھی، کوئی گھر سے نکلتا ہی نہیں



کبھی میں عالم امکاں سے گزر جاتا ہوں
اور کبھی جسم کی دلدل میں اتر جاتا ہوں

یہ بھرا شہر کبھی مجھ میں سمٹ آتا ہے
کبھی میں شہر میں ہر گام بکھر جاتا ہوں

شہر سے رہتی ہے اک جنگ مسلسل دن بھر
شہر جب ہانپنے لگتا ہے تو گھر جاتا ہوں

اس کشاکش میں ہی ملتا ہے نشاں ہونے کا
جب بھی تکمیل کا احساس ہو، مرجاتا ہوں

لے اڑی روشنی ہی جرات بینائی مری
اب تو میں دن کے اجالے سے بھی ڈر جاتا ہوں

اپنے ذرے ہی نظر آتے ہیں تاحد نظر
اک ذرا سر کو جھکاؤں تو بکھر جاتا ہوں

ایک اک آنکھ میں اپنی ہی کہانی دیکھوں
اپنا چہرہ نظر آتا ہے جدھر جاتا ہوں

نظمیں

کیسے استقبال کروں

(بائرن کی ایک نظم......اردو میں)

جس دن ہم دونوں بچھڑے تھے
اشک بہاتے، آہیں بھرتے
دونوں کے دل کانپ رہے تھے
اک لمبی فرقت کے ڈر سے

تیرے ٹھنڈے رخساروں پر
جیسے سرسوں پھول رہی تھی
اس کلفت کی پیشنگوئی
اس بدساعت نے کردی تھی

صبحیں شبنم کے قطروں سے
میری پلکیں بھیگ رہی تھیں
شاید یہ برفیلی بوندیں
آئندہ غم بتلاتی تھیں

تیری باتیں کان پڑیں یوں
جیسے ماتم کی گھنٹی ہو!
میں نے اکثر سوچا کہ تم!
اتنی پیاری کیوں لگتی ہو
جب چھپ چھپ کر ہم ملتے تھے
اب چھپ چھپ کر میں روتا ہوں
اتنی پتھر دل کیوں ہو تم
سوچ کے اکثر میں روتا ہوں

خواب ہوئے سب وعدے ترے
نگر نگر بدنامی پھیلی
میں لوگوں کے طعنے سن کر
ہوجاتا ہوں پانی پانی

اس فرقت کے بعد اگر ہم
مل بھی جائیں خوش بختی سے
کیسے استقبال کروں میں
اشکوں سے کہ خاموشی سے

میری دھرتی، مرے آبا کی زمیں

راجپورہ (بھارت) میں ۲۵ برس بعد اپنا گھر دیکھ کر

وہی دیوار و در و بام وہی پیڑ مگر
اپنے بچھڑے ہوئے چہروں کو کہاں سے لاؤں

ان کی مٹی ہے، نہ خوشبو ہے، نہ سایا ہے کہیں
اپنے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو کہاں سے لاؤں

تیرے بیٹے، وہ مرے بھائی ہیں اے شہر کہاں
اپنی بانہوں، تری آنکھوں کو کہاں سے لاؤں

چلمنو! یاد تو ہوگی تمہیں ان کی عفت
اپنی بہنوں کی دعاؤں کو کہاں سے لاؤں

اجنبی بن کے میں اپنا ہی مکاں تکتا ہوں
آہ! بیتے ہوئے لمحوں کو کہاں سے لاؤں

میری دھرتی، مری بستی، مرے آبا کی زمیں
میرا بچپن، مری یادیں، مجھے واپس کر دے
تجھ سے اب توڑنے آیا ہوں میں سارے رشتے

اپنی بیٹی کے تقدس کی حفاظت نہ کرے
وقت پڑجائے تو بیٹوں کا لہو پی جائے
ایسی دھرتی سے کوئی کیسے تعلق رکھے

میرا بچپن، مری یادیں، مجھے واپس کر دے
تجھ سے اب توڑنے آیا ہوں میں سارے رشتے

محوِ ذات

(ایک سانیٹ)

اب سنے گا کون تیرے غم کی بات

کون دیکھے گا تیرا قلبِ فگار

ہر کسی کو رنج و غم ہیں بے شمار

اب تو ہر دل میں بسی ہے کائنات

روز و شب رہتے ہیں سب ہی محوِ ذات

چھا گیا ہر آنکھ پر ایسا غبار

بے رخی کا دیکھ سکتی ہی نہیں

تیرے رخساروں کے پیلے پیلے پات

بند کر لے اپنے کمرے کے کواڑ

اور جلا پلکوں پہ شمعِ اشک خوں

اپنے سائے کو دکھا زخمِ دروں

اپنے سائے کو دکھا داغِ جگر

ہجر کی دیوار فرقت کے پہاڑ

اپنے سائے سے ہی ہر اک بات کر

آنے والا دن

اب تو جوبن رت چھائی ہے
رنگوں کے بازار سجے ہیں!
بھرے ہوئے ہیں دھیان کے میلے
آشا کے رتنار سجے ہیں

گونجتے ہیں احساس کے نغمے
لپک رہی ہے پیار کی خوشبو
برس رہی ہیں چھم چھم یادیں
پھیلا ہے سپنوں کا جادو

اِک ایسا دِن بھی آئے گا!
جس کے خوف سے لرزاں ہے دل
ایک ٹھٹھرتی شب کی اداسی
جلتا الاؤ بجھتی محفل

ذکر چھڑے گا جوبن رت کا
بچھڑے ساتھی یاد آئیں گے
بھولی باتیں' گزرے قصے
ہم حسرت سے دہرائیں گے

اور سلگتی آگ اچانک بجھ کر راکھ میں ڈھل جائے گی

دیواریں

دل کے بھیانک ویرانے میں
وحشی آندھی
درد کی شدت سے گھبرا کر
جانے کب سے چیخ رہی ہے
لیکن چاروں جانب دیواریں ہیں
جن سے آندھی ٹکراتی
سر پھوڑتی ہے
لوٹ آتی ہے
دل کے بھیانک ویرانے میں
کتنی گرد اڑاتی ہے
میں اس گہری گرد میں اٹ کر
زور سے چیخنے لگتا ہوں
لیکن میرے چاروں سمت ہیں دیواریں
چلتی پھرتی دیواریں!!

پوسٹ مین

سرد ہوا کا پاگل جھونکا

پھٹے ہوئے دامن میں اپنے

دیس دیس سے، نگر نگر سے

تازہ، سوکھے پتے لائے

گھر گھر بانٹتا جائے

کسی پلک سے شبنم ٹپکے

کسی کے دل میں اگنی بھڑکے

کسی کے لب پر نغمے تھرکیں

کوئی خوشی سے گائے

اور ہوا کا پاگل جھونکا

یونہی اپنی دھن میں کھویا

ہر دھڑکن سے آنکھ چرائے

نگر نگر میں، اک اک گھر میں

پتے بانٹتا جائے

کلاس روم

کبھی تو ورڈز ورتھ کے حسین شعر کا بیاں
کبھی فراق کی غزل
کبھی صفر کی ویلیو، کبھی ہے فکرِ برگساں
کبھی بشر کا ارتقاء
بھری کلاس ہے مگر ہر ایک سمت خامشی
بس اک صدا ہے گونجتی
سمٹتے جسم، کرسیوں میں ڈوبتے ہوئے بدن
کمر ذرا جھکی ہوئی
ہر ایک میز پر گداز بازوؤں کے دائرے
ابھرتے سر، تنی بھنویں
ہر اک نگاہ لیکچرر کی سمت دوڑتی ہوئی
ہر ایک گوش مستعد
یہ پات پات صورتیں، یہ باغ باغ انجمن
نہ مل سکیں گی پھر یہاں
بکھیر دے گی وقت کی گھناؤنی ہوا انہیں
نہ جانے کل کہاں کہاں
ابھر پڑیں گی زندگی کی دل گداز راہ میں
جدائیوں کی خندقیں

واپسی

میرے گاؤں کے اونچے پیڑو
دیکھو میری جانب دیکھو
آخر آج میں لوٹ آیا ہوں
ذرا دہکتے جسم پہ میرے اپنا ٹھنڈا سایہ ڈالو

میرے گاؤں کی جسم چراتی گلیو!
دیکھو
میں بھی تمہارا ایک پرانا ساتھی ہوں
اب بھی تمہاری ریت کی خوشبو
میرے لہو میں شامل ہے

میرے گھر کی رنگ بھری دیوارو!
دیکھو' آؤ مجھے پہچانو
یوں تو مجھ سے آنکھ نہ پھیرو
میں تو وہی ہوں
وہی الجھتے بال ہیں میرے
وہی دہکتی آنکھیں ہیں

یونہی لپکتی خوشبوؤں کے پیار میں
اپنا آپ گنوایا
میرا اندر سلگ رہا ہے
ذرا مجھے سینے سے لگا لو
اپنے سندر دل میں بسا لو
مجھے بھی اپنے جیسا بنا لو

تیسویں سالگرہ پر

جب ستاروں سے کوئی اترے
تو تم اس سے کہو
راستوں کی دھول میں شامل ہے اپنی ذات بھی
پیڑ کی چھاؤں میں ہے اپنی مہک
یہ بھی کیا احساس ہے
شبنم ٹپکنے جب لگے

کتنے انجانے خیال
کتنی تشنہ خواہشیں
کتنے چہرے (اب بھی دل پر نقش ہیں)
سایا بن کر ساتھ ساتھ
کتنے ناکردہ گناہوں کی خلش
نیکیوں کی الجھنیں
خواہشیں شعلہ فشاں تو
حوصلے افتادہ پا!!

کہانیاں

(اپنے ایک دوست افضال احمد کی نیویارک میں جواں مرگی پر)

سننی تھیں ہم کو تجھ سے تو کتنی کہانیاں
آنکھوں کی رنگ روپ کی دل کی کہانیاں

کیا کیا نہ خواہشیں تھیں کہ دل ہی میں رہ گئیں
شعلے نہ بن سکیں یہ سلگتی کہانیاں

ٹوٹے گا ایسے حشر کبھی وہم بھی نہ تھا
کس کے گماں میں تھیں یہ تڑپتی کہانیاں

رخصت کیا تھا ہم نے تجھے ہنستے بولتے
لاہور کی فضائیں تھیں مہکی کہانیاں

اب بھی وہی مقام وہی لوگ ہیں مگر
بکھری ہیں تیرے درد میں ڈوبی کہانیاں

جاتے سمے تو کتنی امنگیں تھیں اور اب
تابوت میں سمٹ گئیں ساری کہانیاں

یہ برف برف ہونٹ، یہ آنکھیں مندی مندی

سن لو جو سن سکو یہ ادھوری کہانیاں

نیویارک شہر قہر ہے، وادی ہے موت کی

دل پر ہیں نقش اس کے ستم کی کہانیاں

اک شام دل بھی ڈوبا تھا سورج کے ساتھ ساتھ

اس شام سے ہی پھوٹیں یہ کالی کہانیاں

یہ ڈیڑھ سال ہائے جدائی کا ڈیڑھ سال

صدیوں میں ڈھل گئی ہیں دنوں کی کہانیاں

تیرے خطوط میں ہے تری خوشبو بسی ہوئی

اب یہ سنائیں گے ہمیں تیری کہانیاں

اک ایک لمحہ ہم کو دلاتے رہیں گے یاد

کہتے رہیں گے دل کو رُلاتی کہانیاں

سورج تو ڈھل گیا ہے کسے اب سناؤ گے

اس تیرگی میں شام جی دِل کی کہانیاں

اے وطن کی زمیں

اے وطن کی زمیں

اے وطن کی زمیں

میری ماں میری جاں

مدتوں بعد ہوں تیری آغوش میں

تیری خوشبو میں ڈوبے ہیں یوں جسم و جاں

دل پہ قابو نہیں

خون ہے جوش میں

کتنی صدیوں میں پھیلی تھیں یہ دوریاں

لفظ خاموش ہیں

دم بخود ہے زباں

جھک گئی ہے جبیں

اے وطن کی زمیں

(جنگی قیدی پاکستان واپس پہنچنے پر)

یاایھاالناس

لوگو!

تم تو جانتے ہو

ہم نے جب بھی لب کھولے ہیں

جذبوں کا اظہار کیا ہے

کتنی تیز چلی ہے آندھی

بادل کیسے گرجے ہیں

اور بجلی کیسے کڑکی ہے

اب پھر ایسے لگتا ہے

وقت وہی آنے کو ہے

کلکتہ

مرا سر ندامت سے خم ہے

مجھے خوف سا آ رہا ہے

ہر اک راہ پر زندگی بد دعاؤں میں مصروف ہے

کتنے چہرے ہیں کہ لعنتیں بھیجتے لگ رہے ہیں

ہر اک چوک، پل اور فٹ پاتھ سے آدمی اُگ رہے ہیں

زمیں کیسے انساں اگلنے میں مصروف ہے

میرا دِل کانپتا ہے

خدایا!

انہیں کون پالے گا

یہ موسموں کے عذابوں کو کیسے سہیں گے

انہیں زندگی کی سزا کیوں ملی ہے

کہ تو جانتا ہے

انہیں راستوں سے ہٹانے کی خاطر

ہمیں پھر جہازوں، بموں، دمدموں کے لئے ہاتھ پھیلانے پڑتے ہیں

کہ اَب موت کا اِک یہی راستہ ہے

بنگلور

دھوپ میں جلے چہرے

بارشوں کو ترسے دن

پیاس میں سلگتے لب

جسم ہیں بدلتی رُت

ساڑھیوں میں غزلیں سی

کتنی اَن کہی باتیں

چیختی مشینوں کی

کتنے اَن سنے قصے

نرم گنگ، گلیوں کے

جاگتے میں سوتے گھر

دوڑتے میں ٹھہرے پل

اس کا نام بھی پوچھوں

اس سے ہو تعارف...... پر

کل تو لوٹ جانا ہے

خط بھی لکھ نہیں سکتے

راستے دل وجاں کے...... فائلوں نے روکے ہیں

(1974ء)

بنگلہ دیش

کچھ اور اجڑی ہیں آنکھیں

کچھ اور سوکھے ہیں لب

کچھ اور جسم ترسنے لگے ہیں کپڑوں کو

کچھ اور چہروں پر ابھری ہے داستانِ الم

کچھ اور شہر ہوئے بے اماں عذابوں سے

کچھ اور قہر بڑھا بستیوں پہ موسم کا

یہ لوگ کس کے گناہوں کی پا رہے ہیں سزا

لہو کسی نے بہایا سزا کسی کو ملی

(1972ء)

نئی سوچیں

1993ء سے تاحال

جب بھی آئیں تو نیا روپ دکھائے دلّی

روح پر زخم ہر اک بار لگائے دلّی

یوں تو دلدارئ عشاق میں صدیوں سے مگن

وقت پڑجائے تو آنکھیں نہ ملائے دلّی

وہ جو اوراق مصور تھے فقط کوچے ہیں

میر کی روح کو کیا شکل دکھائے دلّی

خستگی خانہ غالب کی جو دیکھے روئے

وہ گیا وقت ہے کیوں اس کو بلائے دلّی

ساڑھیاں قوس قزح بن کے بکھر جاتی ہیں

حسن احساس سے جب شام سجائے دلّی

لوگ فٹ پاتھ پہ اگتے ہوئے کشکول لئے

کیسی شہ کار تصاویر دکھائے دلّی

اجنبی آنکھ بھی ہوجائے وفا پر مائل

درد کی دھن میں اگر گیت سنائے دلّی

یہ تو پرکھوں کی مہک کھینچ کے لے آتی ہے

ورنہ کیوں کوئی ترے ناز اٹھائے دلّی

جو چمک پہ تری مرتے ہیں انہیں کیا معلوم

روشنی سے بھی حسیں ہیں ترے سائے دلّی

(1998)

دہلی ٹرانزٹ سیل

آپ کا تو دہلی میں داخلہ نہیں ممکن

پرتھوی کو غوری نے کیا شکست دے دی تھی

اعلیٰ افسروں سے ہم پوچھ کر بتائیں گے

کیا محمد ابن قاسم نے اپنے راجہ داہر کو تخت سے اتارا تھا

انٹری رفوذل کے سیل میں ہی رہنا ہے

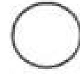
کیا ظہیر بابر نے راجپوتی غیرت کو خاک میں ملایا تھا

ٹوٹے اکھڑے بنچوں پر میلے کالے گدے ہیں

کیا جلال اکبر ہی بادشاہ حقیقی تھا

رات سیل میں کاٹو، صبح اٹھ کے دیکھیں گے

یہ تمہارا اورنگ زیب انتہائی ظالم تھا



ہاں اسی گٹر کو تم باتھ روم سمجھو گے

دیش تو ہمارا تھا حکمرانی تم نے کی

بھول جاؤ ویزے کو یہ تو مل ہی جاتا ہے

یہ ہماری ماتا تھی، تم نے کاٹ ڈالا ہے

اب فلائٹ آنے تک دن یہی بتانے ہیں

ہم تو ایک جیسے ہیں پھر یہ سرحدیں کیسی

دن یہاں جو گزرے ہیں پھر یقین آیا ہے

پرتھوی کو غوری نے کس طرح مٹایا تھا

(1998)

امیگریشن کاؤنٹر

فکر و احساس کا خوں کرتی

انا روندتی

بے حس آنکھیں

درد کا جن میں کوئی رنگ نہیں

روح کو ڈستا ہوا

دل کو مسلتا ہوا سناٹا ہے

یہ عجب شکل کی تنہائی ہے

پہلے کب دیکھی تھی، محسوس ہوئی، یاد نہیں

کھردرے لفظ، سماعت کو کھرچ ڈالتے ہیں

وردیاں جسم سے چہروں پہ چڑھی جاتی ہیں

صورتیں اور بھیانک سی ہوئی جاتی ہیں

فائلیں اٹھ کے گلا گھونٹنے لگتی ہیں۔ بہک جاتی ہیں

کمپیوٹر بھی بدک جاتے ہیں

کتنی ونڈوز پٹخ دیتے ہیں

سہ پہر شام میں ڈھلتے ہوئے عمریں گزریں

ایک سے دوسرا پل آتے بھی صدیاں گزریں

سرحدیں ناگ بنیں، جسم شکنجے میں کسیں

شام سے شام کے سائے لمبے

دور تا حدِ نظر صرف ہے تاریک سرنگ

بہتے دریاؤں کو سرحد بھی کہاں روک سکی

اک مری سوچ دلاتی ہے اجالے کا یقیں

ذہن میں سجتے ہیں امید کے خوش رنگ چمن

(1998)

ہر نظر پیار تو ہر لب پہ ہنسی مانگتے ہیں
ہم تو ہر مانگ ستاروں سے بھری مانگتے ہیں

پھول تو خوب ہی لگتے ہیں جہاں چاہیں کھلیں
ہم تو سرحد بھی گلابوں سے لدی مانگتے ہیں

ہم بھی کیا لوگ ہیں نفرت کے شجر بو بو کر
آسمانوں سے محبت کی جھڑی مانگتے ہیں

ان کی رہ تکتی ہے تاریخ بھی بے چینی سے
سربلندی کو جو نیزے کی انی مانگتے ہیں

غیر اڑنے کو بھی کرتے ہیں فضا تازہ تلاش
ہم کہ رہنے کو بھی اک اندھی گلی مانگتے ہیں

سب کو سلطانی جمہور کا دعویٰ ہے مگر
اختیارات بہ اندازِ شہی مانگتے ہیں

یہاں گلیوں نے مری ماں سے دعائیں چھینیں

واں محلے مری بہنوں سے خوشی مانگتے ہیں

یہاں دریا مرے پرکھوں کے لہو سے کھیلے

واں سمندر مرے بچوں کی بلی مانگتے ہیں

وہ آنکھیں

وہ آنکھیں مہرباں تھیں

یا مری آنکھوں کو لگتا تھا

ان آنکھوں میں محبت کی گھٹا امڈی تھی

یا دل یہ سمجھتا تھا

ان آنکھوں میں چمک تھی آشنا سی

یا یونہی محسوس ہوتا تھا

وہ آنکھیں میری نظریں چومنے کو بے طرح بے تاب رہتی تھیں

مری سوچیں یہ کہتی تھیں

کبھی معصوم لگتی تھیں، کبھی مظلوم لگتی تھیں

وہ آنکھیں جن میں ہر لمحے وفا کے پھول کھلتے تھے

بکھر جائیں سمندر تھیں

سمٹ جائیں تو گوہر تھیں

وہ آنکھیں بولنے لگتیں تو لب خاموش ہو جاتے

وہ آنکھیں دفعتاً حرکت میں آ جاتیں

تو منظر چلنے لگتے تھے

ہوائیں گنگنا اٹھتیں

دیئے سے جلنے لگتے تھے

(1998)

وہ بہت ہی خوبصورت ہے

چلو مانا یہ ہم نے وہ بہت ہی خوبصورت ہے

قیامت اس کی قامت ہے

سمندر اس کی آنکھیں ہیں

گھٹائیں اس کی پلکیں ہیں

جبیں ہے کہکشاں جیسے

نگاہیں گلستاں جیسے

بھنویں کھنچتی کمانیں ہیں

لویں ننگی سنانیں ہیں

حلاوت اس کی باتوں میں

بہاریں اس کی سانسوں میں

لبوں سے لب جو ملتے ہیں

دلوں میں پھول کھلتے ہیں

نظر ہیں مستیاں مئے سی

لچک ہے شاخ گل جیسی

کمر چلتے میں بل کھائے

زمیں بھی ڈگمگا جائے

چلو ہم نے یہ مانا وہ بہت ہی خوبصورت ہے

وہ نکہت ہے صباحت ہے

سخن میں ہے مسیحائی

خیالوں میں ہے رعنائی

غضب جھلمل ہے زلفوں میں

رکی ہے رات بالوں میں

وہ چلتی ہے تو سب راہیں

کُھلیں جیسے حسیں باہیں

جھٹکتی ہے وہ جب گیسو

اتر آتی ہے شب ہر سو

وہ جب انگڑائی لیتی ہے

زمیں کو بانٹ دیتی ہے

گراتی ہے وہ جب بازو

چھڑکتا ہے بدن خوشبو

چلو یہ ہم نے مانا وہ بہت ہی خوبصورت ہے

گلابوں سی نزاکت ہے

صبا جیسی لطافت ہے

بکھرتی ہے تو عنبر ہے

سمٹتی ہے تو گوہر ہے

مہکتی ہے تو صندل ہے

چھلکتی ہے تو چھاگل ہے

وہ جب بھی مسکراتی ہے

تو فطرت جھوم جاتی ہے

گھماتی ہے نگاہوں کو

تو رشک آئے ہواؤں کو

چلو یہ ہم نے مانا وہ بہت ہی خوبصورت ہے

مگر یہ بھی حقیقت ہے

کہ وہ اب اک امانت ہے

ادائیں، حسن، زیبائی

سراپا بزم آرائی

اب اک گھر کی زینت ہے

وہی اب اس کی جنت ہے

ہماری اس سے نسبت ہے

پرستاری عقیدت کی

لکھی سطروں سے الفت کی

یہ رشتہ ہی غنیمت ہے

اسی رشتے میں طاقت ہے

کوئی جو خوبصورت ہے

اسے لفظوں کی چاہت ہے

جھکیں لفظوں پہ جب نظریں

مری سطریں اسے دیکھیں

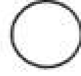
اسے دیکھیں، اسے سوچیں

تہ دل سے گواہی دیں

یقیناً خوبصورت ہے، بہت ہی خوبصورت ہے

قیامت اس کی قربت ہے

(1999)



خون کو ترسا ہوا راستہ رہ جاتا ہے

ہونے ہونے میں کوئی حادثہ رہ جاتا ہے

دو گھڑی حاضری، کچھ پھول، دعا، عرق گلاب

ماں سی ہستی سے بھی یہ واسطہ رہ جاتا ہے

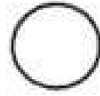
فرد ہو قوم، بلوغت ہے ضروری ورنہ

ذہن اور عمر میں اک فاصلہ رہ جاتا ہے

اپنی تاریخ بھی لکھتے ہیں کچھ ایسے ہم تم

متن اڑ جاتا ہے اور حاشیہ رہ جاتا ہے

(1995)



منہ زور ہو دریا کہ اتر جائے ہمیں کیا

کشتی نہ جو ساحل پہ پہنچ پائے، ہمیں کیا

اخبار کے صفحات میں زندہ ہیں بہت ہے

تاریخ کے اوراق میں کیا آئے ہمیں کیا

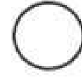
کشکول سلامت ہے تو خیرات فراواں

پندار بکھرتا ہے بکھر جائے ہمیں کیا

دفتر بھی چمکتے ہوئے، بنگلے بھی ہیں روشن

منڈلاتے ہیں بستی پہ اگر سائے ہمیں کیا

(1996)



اتنی بڑھی جو بات کوئی مسئلہ تو تھا
حد سے کسی نے اپنی تجاوز کیا تو تھا

سب دائروں میں گھومتے تھے اور خوش بھی تھے
منزل کی فکر تھی ہی کہاں راستہ تو تھا

اپنی انا کی ریت سے قلعے بنا لئے
آئی جو تیز لہر انہیں ڈوبنا تو تھا

کچے نشانہ باز تھے لڑنے کی ضد بھی تھی
اک دن کسی کا وار مگر چوکنا تو تھا

ہر جنگ باہمی میں تباہی ہے باہمی
تاریخ میں یہ بارہا لکھا ہوا تو تھا

(1997)

محبت جھانکتی ہے

محبت جھانکتی ہے

خواہشوں کی بالکونی سے
تمنا کی منڈیروں سے
کبھی حسرت کی مٹی سے
کبھی امید کی چھت سے

محبت رقص کرتی ہے

کبھی یادوں کے آنگن میں
کبھی احساس کی دُھن پر
کبھی صحن ندامت میں
کبھی تہمت کی وادی میں

محبت پھوٹ پڑتی ہے

کہیں ماں کی دعاؤں سے
کہیں اک نرم کونپل میں
کہیں مٹّی کی خوشبو میں
کہیں بچے کی غوں غوں میں

1999)

اک سمندر ، شہر کو آغوش میں لیتا ہوا
اک سمندر تیرے میرے درمیاں پھیلا ہوا

ایک جنگل جس میں انساں کو درندوں سے ہے خوف
ایک جنگل جس میں انساں خود سے ہی سہما ہوا

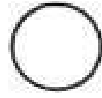
ایک دریا جو بجھا دیتا ہے میدانوں کی پیاس
ایک دریا خواہشوں کی پیاس کا چڑھتا ہوا

ایک صحرا جس میں سناٹا، بگولے اور سراب
ایک صحرا حسرتوں کی ریت بکھراتا ہوا

ایک موسم جو بدلتا ہے نظر کے پیرہن
ایک موسم مدتوں سے فکر پہ ٹھہرا ہوا

ایک گلشن ہے رتوں کے آنے جانے کا اسیر
ایک گلشن سب رتوں میں ذہن مہکاتا ہوا

(1999)



کوئی موسم تو مہکتی ہوئی صبحیں لائے

جام چھلکاتی جنوں بانٹتی شامیں لائے

کوئی مستی تو مرے شہر کو آغوش میں لے

یاس کی برف گھلے، آس کی موجیں لائے

کوئی خوشبو تو ہمیں بخش دے ہونے کا یقیں

وقت کے رخ کو بدلنے کی امنگیں لائے

کوئی بادل تو بٹھا دے مری گلیوں کا غبار

سونے چہروں پہ امیدوں کی بہاریں لائے

(1999)

صبح دربار میں اک شان سے بیٹھا دیکھوں

شب کو تاریخ کے اوراق میں رسوا دیکھوں

کسی لمحے کا پکڑ ہاتھ نکل جاؤں کہیں

وقت کی آنکھ میں صدیوں کا اترنا دیکھوں

رنگ برساتی ہوئی رت کو چھپالوں گھر میں

اور کھڑکی سے زمانے کو ترستا دیکھوں

سخت بدلے ہوئے پت جھڑ کے ہیں تیور اب کے

صرف پتے نہیں پیڑوں کو بھی گرتا دیکھوں

کام کی آس میں اوزار سجائے مزدور

پھول امید کا فٹ پاتھ پہ کھلتا دیکھوں

1999)

اے کارگل اے کارگل

یہ زخم تو ہے روح پر، ہوگا کہاں یہ مندمل
بکھرا ہے غیرت کا لہو، ڈوبے ہوئے ہیں سب کے دل
اے کارگل اے کارگل

سرسبز تیری چوٹیاں، کل فتح کی تھی داستاں
اب ہیں ہماری پستیاں، ان کے بیاں سے متصل
اے کارگل اے کارگل

کیا پیشقدمی، انخلا، کیا غیر سے مانگا گیا
ہم سے کہاں پوچھا گیا، ہم بے خبر تھے مستقل
اے کارگل اے کارگل

سرحد کسی نے پار کی، پسپائی کس نے مان لی
شرمندگی سب کو ہوئی، اک مملکت ہے منفعل
اے کارگل اے کارگل

اغیار ہم پہ خندہ زن، احباب ہم پہ طعنہ زن
دشمن ہے اب بھی خیمہ زن، لیکن قیادت مضمحل
اے کارگل اے کارگل

(1999)

اونچی نیچی شان اپنی ، صرف پاکستان سے

نعمتیں دیں کتنی رب نے کیسے تم جھٹلاؤ گے
ایسی جنت روئے ہستی پر کہاں تم پاؤ گے
اپنے گھر کی طرح اس کا درد بھی دل میں رکھو
ورنہ اک دن دیکھنا تم بے اماں ہو جاؤ گے

اب تو ہے پہچان اپنی صرف پاکستان سے
جان میں ہے جان اپنی صرف پاکستان سے
اس کا حاصل اپنا حاصل، اور زیاں اپنا زیاں
اونچی نیچی شان اپنی صرف پاکستان سے

یہ اگر محفوظ ہے تو اپنے گھر محفوظ ہیں
یہ اگر مضبوط ہے تو اپنے در مضبوط ہیں
یہ ہے سرفراز تو دستار اپنی سرفراز
یہ اگر مسرور ہے تو اپنے لب مسرور ہیں

دل بھی یہ ہے، جاں بھی یہ ہے، ہم کہاں اس کے بنا

اس کی عزت اپنی عزت، اس میں ہے اپنی بقا

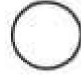
چند لوگوں کا نہیں ہے، سب کا پاکستان ہے

اس کی دولت سب کی دولت، اس پہ حق ہر ایک کا

اپنے گھر کی طرح اس کو ہر قدم چمکائیں گے

جانتے ہیں ورنہ اک دن بے اماں ہو جائیں گے

(2000)



ہم اک ذرا سی خاک ہیں کہاں کسی شمار میں
ہوا جو تیز چل پڑے تو جا ملیں غبار میں

کسی بدن کے بام سے بھی چاند جھانکتا نہیں
اتر چکی سروں کی فصل کیا ترے دیار میں

نکل کے دیکھ صبحدم، گلاب رنگ رنگ کے
ہزار ناز سے کھلے بسوں کے انتظار میں

ہم اپنی عادتوں کے یوں اسیر بن کے رہ گئے
نئی جہت میں سوچنا رہا نہ اختیار میں

(1999)

پرندے اور انسان

پرندوں اور انسانوں میں کتنی قربتیں ہیں

اور کتنی عادتوں میں ایک جیسے ہیں

بہار آئے تو کتنے چہچہاتے ہیں

خزاں ہو تو کتنی خامشی سے کاٹ لیتے ہیں

کبھی طوفاں میں گھر جائیں

تو سر گردن میں دے کے بیٹھ جاتے ہیں

دعائیں مانگتے ہیں کہ طوفان اب تو ٹل جائے

یہ اک دن تو نکل جائے

کبھی سورج نکلنے پر

کبھی سورج نکلتے ہی

کبھی سورج سے پہلے ہی

تلاش آب ودانہ میں نکل پڑتے ہیں اپنے آشیانوں سے

کسی دن لوٹ آتے ہیں

کسی دن ڈوب جاتے ہیں

پرندوں اور انسانوں میں قربت کی گواہی پیڑ دیتے ہیں

کہ دونوں کو گھنا سایہ درختوں سے ہی ملتا ہے

کبھی جھیلوں سے ان دونوں کی گہری پیاس کی پوچھو

جہاں پانی بھی ملتا ہے

اور اپنا آپ بھی موجوں میں لہراتا ہوا یہ دیکھ سکتے ہیں۔

مگر اک موڑ ایسا ہے

جہاں انساں پرندوں سے بہت ہی مختلف معلوم ہوتا ہے

پرندے بلکہ انساں سے بہت ہشیار لگتے ہیں

کہ انساں دوسرے انسانوں کو کتنا دھوکہ دیتے ہیں

کبھی اک دوسرے کے پھانسنے کو جال بنتے ہیں

مگر اب تک کسی نے یہ نہیں دیکھا

کبھی کوئی پرندہ جال پھیلا کر

کسی دوجے پرندے کو پکڑ کر قید میں ڈالے

کسی کی جان سے کھیلے

کسی سے زندگی چھینے

(1997)

نئی صدی

ہر نیا لمحہ یہ پیغام ہمیں دیتا ہے

ابھی مایوس نہیں خالق و رازق ہم سے

وقت کا قیمتی انعام ہمیں دیتا ہے

اک گھڑی بانٹتی ہے دہر میں امکاں کتنے

کرہ ارض پر آباد ہیں انساں جتنے

ساعتیں گود میں تقدیر لئے پھرتی ہیں

کہیں لمحوں کی جبینوں پہ کھلے ہیں موسم

رات کہتی ہے ستاروں سے نگاہیں بھر لو

دن بلاتا ہے چلے آؤ سمیٹو کرنیں

پل ہر اک راہ کو خوشبو میں بسا دیتے ہیں

میرے مالک، مرے مختار، یہ سب تیرا کرم

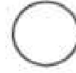
تیری 'اک کن' میں مچلتی ہیں ہزاروں صدیاں

کیا کمی تیرے خزانے میں بھلا آئے گی

یہ صدی کر دے مرے نام مرے دیس کے نام

صبح روشن میں بدل جائے وطن کی ہر شام

(یکم جنوری 2000)



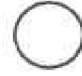
آہستہ ذرا عمر رواں، آخری دن ہیں
اک نظر کرم دشمنِ جاں، آخری دن ہیں

اک فیصلہ کن موڑ پہ ہے شہر کا موسم
کچھ اور لہو اور دھواں، آخری دن ہیں

ہر ممکنہ مقتول نے پہچان لیا ہے
سب ممکنہ قاتل ہیں یہاں، آخری دن ہیں

آنکھوں میں رکے شورش پنہاں کے سمندر
اک آگ اگلتی ہے زباں، آخری دن ہیں

(1996)



تاریخ شرمسار ہے، ابواب منتشر
الفاظ اشکبار ہیں اعراب منتشر

نقشہ بدل رہا ہے مرے آس پاس کیا
صدیوں سے شانت سرحدیں بے تاب منتشر

اپنی زمیں کے عشق سے جب خوں نہ گرم ہو
رہتا ہے ذہن مضمحل، اعصاب منتشر

اسکول بس کی منتظر بچی کی آنکھ پڑھ
ہوجائیں گے زوال کے اسباب منتشر

تعبیر کچھ تو اس کی بھی اے اہل خواب ہو
کیوں ہورہے ہیں خواب میں ہی خواب منتشر

(1998)

کتنے سال رُل جاتے، میں اگر نہیں ہوتا
کس کی عمر بن پاتے، میں اگر نہیں ہوتا

مجھ سے پہلے جو کچھ تھا، مجھ سے بعد جو کچھ ہے
دونوں کٹ کے رہ جاتے، میں اگر نہیں ہوتا

جو بھی نقش دائم تھا، میرا خون لازم تھا
رنگ کیسے بھر پاتے، میں اگر نہیں ہوتا

سانس میرے حصے کے، لفظ میرے قصے کے
روپ کس طرح پاتے، میں اگر نہیں ہوتا

فرض گر حضوری تھا، پھر تو میں ضروری تھا
حکم کس پہ فرماتے، میں اگر نہیں ہوتا

مشاعرے

خوب ہنستے ہو طنزیے سن کر
کھل ہی پڑتے ہو عشقیے سن کر
جھوم جاتے ہو، سر ہلاتے ہو
بول شاعر کے مدھ بھرے سن کر

ویسے زخمی ہو کتنے اندر سے
دل ہے بے کل تو روح پیاسی ہے
مسکراہٹ سجی ہے چہروں پر
اور رگ رگ میں اک اداسی ہے

بھول سکتے ہو زندگی کے غم
چند لمحوں کی واہ واہ سے کیا
ڈوب کر داد کے سمندر میں
بھاگ سکتے ہو آہ آہ سے کیا

تم پہ جو بیتتی ہے وہ بھی سنو
یہ سنو گے تو سوچنا ہوگا
جب بھی سوچو گے گھر سے نکلو گے
گھر سے نکلو گے سامنا ہوگا

سامنا ہوگا دن بھی بدلیں گے
دن جو بدلیں گے کچھ کو غم ہوگا
کچھ کو غم ہوگا، سب تو خوش ہوں گے
سب جو خوش ہوں گے کیا یہ کم ہوگا

تم پہ جو بیتتی ہے وہ بھی سنو
کبھی سنجیدہ شاعری بھی سنو
کبھی تاریخ کے ورق بھی پڑھو

وقت کی باگ اپنے ہاتھ میں لو
یوں نہ لمحوں کو دھول ہونے دو

(1997)

دلداریٔ نبود میں ہے اعتبارِ جاں
بیگانگیٔ ہست پر ہے اختیارِ جاں

ہنگامۂ نمود فقط عکس آرزو
نیرنگیٔ وجود فقط اضطرارِ جاں

غلطاں ہیں کب سے ورطۂ حیرت میں ذہن و دل
کیوں ہے مآلِ گردشِ دوراں، قرارِ جاں

انجام تو وہی ہے شکستن، گداختن
رقصاں ہے کیوں ابد سے مسلسل نگارِ جاں

فصلِ سپردگی تو ہے تیار، منتظر
کس کے نصیب میں ہے نہ جانے بہارِ جاں

لمحات محوِ رقص ہیں، آفاق مضطرب
یہ موسمِ شگفتنِ زخمِ شرارِ جاں

(1995)

آنکھیں جیسی لگتی ہیں ویسی ہوتی نہیں ہیں

دیکھنے میں جو آنکھیں میلی لگتی ہیں

تیز اُجالے ان کے اندر ہوتے ہیں

ان کے من میں کئی سمندر ہوتے ہیں

روشنیوں کے دریا جن میں گرتے ہیں

جانے کب دن پھرتے ہیں

دیکھنے میں جو آنکھیں بھیگی ہیں

ان کی تہ میں کتنے طوفاں ہوتے ہیں

ان کے پیچھے کئی بیاباں ہوتے ہیں

جن میں دن بھر ریت کے بادل اڑتے ہیں

ٹوٹے دل کب جڑتے ہیں

مرا تابوت کس پرچم میں لپٹے گا؟

لہو تو روز بہتا ہے

کلاشنکوف تو بارود ہر دن ہی اگلتی ہے

اجل سڑکوں پر ہر پل زندگی کی راہ تکتی ہے

نہ جانے کونسی گولی پہ میرا نام لکھا ہے

نہ جانے کس کے ہاتھوں میں یہ مشکل فیصلہ ہوگا

کئی رنگوں، زبانوں اور نسلوں کے ہزاروں پرچموں میں کونسا پرچم مناسب ہے

عجب سی ہے یہ الجھن بھی

عجب سا ہے یہ خدشہ بھی

مرا تابوت کس پرچم میں لپٹے گا؟

(1999)

دیکھنے میں جو آنکھیں سہمی سہمی ہیں

ان کے اندر خواب اڑتے رہتے ہیں

تیز سنہرے گہرے دریا بہتے ہیں

جن کے کناروں پر خواہش دکھ جنتی ہے

یوں کب قسمت بنتی ہے

دیکھو، ایسی ہوتی نہیں ہیں

آنکھیں جیسی لگتی ہیں

(1999)

ایک دعا، دونوں صدیاں ملتے وقت

یارب! ہمارے ظرف سے بڑھ کر نہ پیاس دے
لکھا ہے جو نصیب میں، اتنی ہی آس دے

مر جائیں ہم نہ ذات سے مغلوب ہوں کبھی
اپنی زمیں سے عہد کا کچھ ایسا پاس دے

ہر ہم وطن کے ذہن سے مٹ جائیں نفرتیں
لہجے میں رہنماؤں کے اب وہ مٹھاس دے

جو ظلم سہ سکیں نہ کبھی جھوٹ سن سکیں
ایسے ضمیر بخش دے، ایسے حواس دے

پھیلیں ہمارے ہاتھ نہ غیروں کے سامنے
عریاں ہوس نے کر دیا، کوئی لباس دے

تیری عطا سے قوت جوہر تو مل گئی
اب ہم کو حکمران بھی جوہر شناس دے

(جون 2000)

خوف بٹتا رہا اخبار کے ساتھ

صبح دم پھیل گئی تازہ لہو کی خوشبو

خوف بٹتا رہا ہر گیٹ پر اخبار کے ساتھ

سرخیاں ڈالتی تھیں ہاتھ گریبانوں پر

لفظ شرمندہ تھے نفرت کی کہانی بن کر

رنگ نادم تھے تصاویر جنوں میں ڈھل کر

اشتہارات بھی پیغام اجل دیتے تھے

نعش رکھنی ہے تر و تازہ...... فریز رحاضر

جاں بلب شہر کی چیخیں ہوں کہ

شعلوں کی لپک

بڑی اسکرین ہو ٹی وی کی

مزا آتا ہے

(2000)

ربّنا، یا ربّنا

ربّنا، یا ربّنا، یا ربّنا، ابر کرم
کھول دے رحمت کے در سیراب کردے ہر قدم

تیری ہر مخلوق تیرے رحم کی ہے منتظر
یہ پرندے، یہ مویشی، یہ زمینیں، یہ شجر
پیاس سے بدحال انساں، یہ اجڑتے بام و در
یہ سسکتے زرد چہرے، ہر نگر تصویرِ غم

کھول دے رحمت کے در سیراب کردے ہر قدم
ربّنا، یا ربّنا، یا ربّنا، ابرِ کرم

بوند پانی کو ترستی ہیں یہ سوکھی ندیاں
مانگتی ہیں زندگی کے رنگ سونی بستیاں
قہر برساتا ہے سورج، بخش دے اپنی اماں
دھوپ بھی تیری عطا ہے، چھاؤں بھی تیرا کرم

کھول دے رحمت کے در سیراب کردے ہر قدم
ربّنا، یا ربّنا، یا ربّنا، ابرِ کرم

جاں سے کیوں گزرتے ہو

(عازمین خودکشی کے نام)

تم تو میرے بازو ہو
ماں کے دل کی خوشبو ہو
آس تم بزرگوں کی
شان تم جوانوں کی
تم چمن کی زینت ہو
تم وطن کی طاقت ہو
آج کی تمنائیں
کل کی ساریں امیدیں
سب بندھی ہیں تم سے ہی
سب جڑی ہیں تم سے ہی
تم چمن کی زینت ہو
تم وطن کی طاقت ہو

یہ جواں چمکتے دن
عزم سے دمکتے دن
کتنے خوبصورت ہیں
یہ تمہاری دولت ہیں

تم چمن کی زینت ہو
تم وطن کی طاقت ہو

مست رُت جوانی کی
یہ کلی جوانی کی
ایک بار ملتی ہے
ایک بار کھلتی ہے

تم چمن کی زینت ہو
تم وطن کی طاقت ہو

زندگی حسیں تحفہ
دو جہاں کے مالک کا
آدمی تو نائب ہے
اس زمیں پہ خالق کا

تم چمن کی زینت ہو
تم وطن کی طاقت ہو

زندگی محبت ہے

عاشقی ہے الفت ہے

شان سے رہو زندہ

آن سے رہو زندہ

تم چمن کی زینت ہو

تم وطن کی طاقت ہو

رنج ہے کہ تنہا ہو

سوچتے کیوں ایسا ہو

یہ جہاں تمہارا ہے

یہ سماں تمہارا ہے

تم چمن کی زینت ہو

تم وطن کی طاقت ہو

ساتھ ماں کی ممتا ہے

باپ کی تمنا ہے

سچا پیار بہنوں کا

اعتماد سجنوں کا

تم چمن کی زینت ہو

تم وطن کی امانت ہو

جاں سے جب گزرتے ہو

کب اکیلے مرتے ہو

جس بھی دل کی خوشبو ہو

جس بھی گھر کا بازو ہو

وہ بھی ڈوب جاتے ہیں

وہ بھی سہم جاتے ہیں

نور ہو جن اکھین کا

چاند ہو جس آنگن کا

جس بہن کا آنچل ہو

جس نظر کا سانول ہو

پہلے ان کا سوچو بھی

مڑ کے ان کو دیکھو بھی

جان سے کیوں گزرتے ہو

جیتے جی کیوں مرتے ہو

شان جینے والوں کی

ریگ زار جلتے ہیں حسرتوں کی حدّت سے
بے قرار ہیں صحرا آرزو کی شدّت سے
دشت دشت بے چینی خواہشوں کی ہیبت سے
جانے کیسا لمحہ تھا
عرش پہ تھا سناٹا
دم بخود زمانہ تھا
وقت سہما سہما تھا
آسماں تڑپتا تھا
خون خون دریا تھا
ذہن ذہن حیرانی ہر جبیں ندامت ہے
اک خلش کہ دائم ہے اک الم روایت ہے
اک گداز پیہم ہے جاوداں امانت ہے
فیصلہ یہ کیسا تھا
وقت ہی بدل ڈالا
عرش پھر نہیں کانپا
آسماں نہیں رویا
چاند پھر نہیں ڈوبا
شمس پھر نہیں سہما

سر جہاں پہ جھکتے ہیں برکتیں نہیں ملتیں
آمروں کے محلوں میں رحمتیں نہیں ملتیں
کربلا سے دوری میں عظمتیں نہیں ملتیں

یہ تو ایسا لمحہ تھا
جب لہو پکارا تھا
اس میں اک ازل بھی تھا
اس میں اک ابد بھی تھا
سچ لہو سے ابھرا تھا
دشت دشت پھیلا تھا
شہر شہر چھایا تھا
ہر صدی کا عنواں تھا

ہر صدی کا عنواں ہے سر بلند انساں ہے
آن جینے والوں کی شان جینے والوں کی
کربلا کے دم سے ہے
کربلا کے غم سے ہے

(1999)

مسلک کی دہشتیں

کچے گھروں کو غسل
مکینوں کے خون سے
دیوانہ وار رقص پھر
پورے سکون سے

دیوار و در پہ نقش ہیں
مسلک کی دہشتیں
ذہنوں میں دندناتی ہیں
بدمست وحشتیں

وحدانیت کے نام پر
مخلوق منقسم
جذبات کی کدال سے
بنیاد منہدم

افکار کی تراش
عقائد کی نوک سے
کیا نسل اُگ رہی ہے
ہدایت کی کوکھ سے

(1998)

کھلا نہ اس کی اداؤں میں حیرتیں کیوں تھیں
وہ جانِ بزم تھی پھر بھی کھنچی رگیں کیوں تھیں

وہ اپنے آپ میں رہتی تھی جب مگن اتنی
تو دوسروں کی نگاہوں کی خواہشیں کیوں تھیں

وہ ماہتاب تھی رگ رگ سے پھوٹتی تھی کرن
نہ جانے پھر بھی اجالوں کی حسرتیں کیوں تھیں

(2004)

وہی الفاظ

کبھی تم نے یہ سوچا ہے

کبھی تم نے یہ دیکھا ہے

کہ لفظوں میں

کہ لفظوں سے تصادم کیسے ہوتا ہے

تباہی کیسے آتی ہے

وہی الفاظ جو دو پیار کرنے والوں میں تعلق جوڑتے ہیں

دلوں میں ربط رکھتے ہیں

اور ایسا ربط، اک دوجے کی خاطر جان بھی دے دیں

وہی الفاظ کیسے شعلے بن کر دہشتوں کا رقص کرتے ہیں

وہی الفاظ کیسے زہر بن کے ایک اک رگ میں اترتے ہیں

بھرے شہروں کو سناٹا نگل لیتا ہے

بہنیں بین کرتی ہیں

پہاڑوں سے جواں بھائی

انہی لفظوں کی تلواروں سے گردن کاٹ لیتے ہیں

تو مائیں آسماں سر پہ اٹھاتی ہیں

یہی الفاظ ماؤں کے لبوں سے جب دعا بن کے ابھرتے ہیں

فرشتے کانپ جاتے ہیں

یہی الفاظ پھر اللہ کی رحمت میں ڈھلتے ہیں

ہمارے دن بدلتے ہیں

تو پھر یہ سوچنا ہوگا

تو پھر یہ دیکھنا ہوگا

کہ یہ الفاظ خود قاتل نہیں ہوتے

کہ یہ الفاظ خود اندھے نہیں ہوتے

یہ الفاظ خود ظالم نہیں ہوتے

مگر ہم بولنے والے ہی رستہ بھول جاتے ہیں

مگر ہم بولنے والے ہی آنکھیں پھوڑ لیتے ہیں

بصیرت سے

دیانت سے

صداقت سے

محبت سے

تعلق توڑ لیتے ہیں

(1999)

کسی دن سو کے اٹھیں

کسی دن سو کے اٹھیں

گھر سے نکلیں

اور یہ معلوم ہو

گلیاں، گزرگاہیں، سبھی سڑکیں

اٹھالی ہیں کسی نے

اب نہ موٹروے، نہ بائی پاس ہے کوئی

فقط اپنے مکاں ہیں

عمر اب ان میں بتانی ہے

یہی اپنی کہانی ہے

(1999)

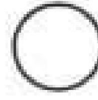


ہم یہاں تھے نہ وہاں تھے پہلے
ہیں وہیں اب بھی جہاں تھے پہلے

آج خاموش ہیں خوشبو کی طرح
اور کیا شعلہ بیاں تھے پہلے

اپنی آواز میں گم ہیں اب تو
شہر والوں کی زباں تھے پہلے

(2003)



ہیں یہ تخلیق اک گھڑی کی مگر
اجنبی آسماں زمیں کتنے

بے حسی وہ کہ اپنے جسموں پر
مکڑیاں جال بن گئیں کتنے

(1995)

سائیکلون 2A

یوں سمندر نے کبھی موت نہیں بانٹی تھی

لہر کی آنکھ میں یہ قہر کہاں تھا پہلے

یوں ہوا ہاتھ میں کب تیغ لیے پھرتی تھی

ابر کی پوٹ میں یہ زہر کہاں تھا پہلے

کشتیاں آج ہی کیوں رسمِ وفا بھول گئیں

بحر کی گود نے ممتا کا چلن چھوڑ دیا

موج سینے سے لگانے کی ادا بھول گئی

ساتھ منجدھار نے صدیوں کا معاً چھوڑ دیا

خواہشیں ڈوب گئیں، پیار بھی غرقاب ہوئے

دائمی نیند میں ڈھلتی گئی اک رات کی نیند

بستیاں آب ہوئیں گوٹھ کہ سب خواب ہوئے

اک قیامت میں بدلتی گئی برسات کی نیند

شاہ جو سندھ کے ساحل سے صدا آتی ہے

یوں 'سچل' نے کبھی صحرا کو نہ روتے دیکھا

'لال شہباز' کا گنبد بھی منا جاتی ہے

یوں نہ ''میروں'' کو گئے وقت نے سوتے دیکھا

اب کہیں ''بھیج پگاڑا'' نہ ''جئے بھٹو'' ہے

گھر، نگر، راستے، بازار ہیں پانی پانی

جانے مومل ہے کہاں اور کہاں رانو ہے

عارض و گیسو و رخسار ہیں پانی پانی

زندگی بھر جو بچایا تھا معاً ڈوب گیا

آرزوؤں سے بھرا اپنا چمن ڈوب گیا

جب ضرورت تھی، نہیں آئے جگانے والے

اب تو سرگرم ہیں دن رات زمانے والے

(1999)

ہم اب سب منتظر ہیں۔ مگر کس کے

ہم اب سب منتظر ہیں

پوری شدت سے

مگر کس کے......؟

خبر کس کو......؟

مگر سب منتظر ہیں

سمندر! ہم تمہارے منتظر ہیں

ہمارے ظرف گہرائی سے عاری ہو چکے ہیں

تمہیں زحمت تو ہوگی، آ کے سمجھاؤ

کہ گہرائی میں پانی کیسے بہتا ہے؟

سکوں چہرے پہ دائم کیسے رہتا ہے

وہ جب آتی ہیں پورے چاند کی راتیں

تو کیسے جوش آتا ہے؟